دسمبر ۲۰۰۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

SCHOOL FOR CONTEMPORARY
AND
ISLAMIC LEARNING

SCIL

NURSERY TO O/A LEVEL

- TEFL TRAINED TEACHERS
- Computers and Visual Aids
- Nazira Quran and Tajweed
- Quranic Studies and Sirah
- Sports, Riding, Shooting
- Arts and Crafts
- Hifz
- Arabic Language

"Teaching Modern Contemporary Subjects in a progressive and Supportive Islamic environment with special emphasis on moral values and Character building".

Admissions Open
Nursery-Class 4

20A-C/3 GulbergIII
Main M.M Alam Raod, Lahore
Phone: 5712793, 5756594

VISION
FOR
TOMORROW

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۵۲

شمارہ: ۱۲

شوال المکرم ۱۴۲۴ھ

دسمبر ۲۰۰۳ء

فی شمارہ ۱۲/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

☆ اندرون ملک 125 روپے

☆ ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ 800 روپے

☆ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ 1000 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36-کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700' فون: 03-02-5869501

فیکس: 5834000 ای میل: anjuman@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67-گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور

فون: 6316638-6366638 فیکس: 6305110

ای میل: markaz@tanzeem.org

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

✿ **عرض احوال** ——— 3

حافظ عاکف سعید

✿ **تذکرہ و تبصرہ** ——— 4

موجودہ عالمی حالات میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر قرآن حکیم کی راہنمائی

حافظ عاکف سعید

✿ **منتخب نصاب۔۲** ——— 9

'اطاعت امر' بمقابلہ 'تنازع فی الامر'

ڈاکٹر اسرار احمد

✿ **خطوط و نکات** ——— 39

ایک اہم نصیحت نامہ از جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو

اور اس کا جواب از بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

✿ **دنیائے اسلام** ——— 69

البانیہ

سید قاسم محمود

✿ **نگاہ واپسیں** ——— 81

اشاریہ ''ماہنامہ میثاق''

جنوری ۲۰۰۲ء تا دسمبر ۲۰۰۳ء

مرتب: طارق اسماعیل ملک

❀ ❀ ❀

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض احوال

صدر مملکت جنرل پرویز مشرف نے علماء و مشائخ کے ساتھ اپنی حالیہ ملاقات کے دوران اسلام کا نہایت محدود تصور پیش کیا ہے۔ انہوں نے اسلام کو ایک مذہب کے طور پر بیان کیا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسے نوع انسانی کے لئے ایک دین بنا کر اتارا ہے۔ جنرل مشرف کے نزدیک اسلام محض روزے رکھنے' زکوٰۃ دینے اور حج و عمرہ ادا کرنے ہی کا نام ہے اور اسی کو وہ موڈریٹ اسلام کہتے ہیں' جبکہ درحقیقت یہ عبادات ایک مسلمان کے ایمان کی بنیادیں ہیں اور ان پر اسلام کی اصل عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ صرف انفرادی عبادات اور شخصی نیکیوں کا ڈھیر لگاتے رہنا اسلام کی اصلی روح نہیں ہے' بلکہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات اور زندگی گزارنے کا لائحہ عمل ہے۔ تعجب اور حیرت تو اس بات پر ہے کہ جنرل مشرف ایک جانب تو موڈریٹ اسلام کا تصور دیتے ہوئے خود کو اسلام کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں اور دوسری جانب ان اسلام دشمن عالمی طاقتوں کے اتحادی ہونے کا دم بھرتے ہیں جو اسلام کی جڑیں کاٹنے کے درپے ہیں۔ قرآن میں واضح طور پر یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی سے منع کیا گیا ہے اور یہود و نصاریٰ کو اسلام کے سب سے بڑے دشمن قرار دیا گیا ہے' جبکہ موجودہ حکومت انہی کی حلیف بن کر اسلام کی اس ناقص تعبیر کو فروغ دینا چاہتی ہے جو یہود و نصاریٰ کے نزدیک قابل قبول ہے۔ ہمارا یہ طرز عمل دین سے بے وفائی کے مترادف ہے اور اللہ کے غضب کو دعوت دینے کا موجب ہے۔

اسلام کے جس تصور کو حکومتی سرپرستی میں ابھارا جا رہا ہے وہ نہایت محدود اور ناقص ہے۔ دین محض نماز روزے کا نام نہیں بلکہ زندگی کے ہر گوشے میں قرآن و سنت کی رہنمائی کو اختیار کرنے کا نام ہے۔ انفرادی زندگی کے ساتھ معاشرے اور ریاست کی سطح پر بھی قرآن و سنت کی تعلیمات کو پورے طور پر نافذ کرنا دین اسلام کا اہم ترین تقاضا ہے۔ دین کی صحیح فکری رہنمائی ہمیں صرف قرآن مجید سے حاصل ہو سکتی ہے جو اللہ اور رسولؐ کی کامل اطاعت کو ہر مسلمان کے لئے لازم قرار دیتا ہے جبکہ آج بحیثیت مجموعی ہم نے قرآن کو اپنی زندگی سے نکال رکھا ہے۔ ہم شاید یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن محض حصول ثواب یا ایصال ثواب کے لئے نازل ہوا ہے اور ایک مسلمان ہوتے ہوئے ہمیں قرآنی تعلیمات کی ضرورت نہیں ہے اور محض چند عبادات پر عمل کرنے سے دین کے تمام تقاضے پورے ہو رہے ہیں۔ یہ خیال قرآن و سنت کی تعلیمات سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم نہ صرف انفرادی زندگی میں قرآن کے احکام کو لاگو کریں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر معاشرتی اور ملکی سطح پر اللہ کے نظام کو نافذ کرنے کی جدوجہد کریں۔ oo

موجودہ عالمی حالات میں

انفرادی اور اجتماعی سطح پر

قرآن حکیم کی رہنمائی

مسجد دارالسلام باغ جناح میں امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید کے
21 نومبر 2003ء کے خطاب جمعہ کی تلخیص

آج جمعۃ الوداع کا مبارک دن ہے۔ جمعۃ المبارک کے اجتماع کا مقصد تعلیم بالقرآن ہے۔ قرآن کا اصل پیغام یہ ہے کہ انسانیت کو تمام استحصالی نظاموں سے نجات دلا کر اس روئے ارضی پر اللہ کا دیا ہوا نظام عدل وقسط قائم کیا جائے۔ لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم قرآن کو نہیں پڑھتے' اگر پڑھتے ہیں تو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ چنانچہ ہم اپنے دین کو صرف نماز روزے تک محدود کر لیتے ہیں۔ آج ہم سورۃ الحدید کے تیسرے رکوع کی چند آیات کا مطالعہ کریں گے جہاں انفرادی سطح پر انسانی زندگی کے حوالے سے درکار رہنمائی کے ضمن میں اہم پہلوؤں کا بڑی جامعیت سے احاطہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (آیت ۲۰)

''جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت (و آرائش) اور آپس میں فخر (وستائش) اور مال واولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی طلب سے عبارت ہے۔ (اور اس زندگی کی) مثال ایسی ہے جیسے بارش سے کھیتی اگتی

ہے جو کسانوں کو خوب بھلی لگتی ہے اور پھر وہ خوب زور پر آتی ہے اور پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ جاتی ہے' پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے۔ اور آخرت میں (نافرمانوں کے لئے) سخت عذاب ہے اور (فرمانبرداروں کے لئے) اللہ کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے۔ اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں۔''

اس آیۂ مبارکہ میں انسان کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ جس دنیا کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے وہ دھوکے کا سامان ہے اور عارضی ہے' جبکہ حقیقی زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ جس شخص کی ساری تگ و دو اس دنیا کے لئے ہے وہ خسارے میں ہے اور آخرت میں وہ یقیناً شدید عذاب سے دوچار ہوگا۔ لیکن جو شخص آخرت کو مطلوب و مقصود بنا کر زندگی گزارے گا وہ آخرت میں اللہ کی بخشش اور خوشنودی کے انعام سے نوازا جائے گا۔

اس آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے دراصل انسانی زندگی کے پانچ مراحل کا تذکرہ کیا ہے جو ہر انسان پر آنے ہیں چاہے وہ دنیا کے کسی خطے میں رہتا ہو۔ سب سے پہلا مرحلہ عہد طفولیت کا ہے' جسے اس آیت میں ''لعب'' یعنی کھیل کود سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جب بچہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو اس کھیل کود کے ساتھ ''لھو'' یعنی تماشے کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ تیسرا مرحلہ جوانی کا آتا ہے' اب اسے زیب و زینت اور آرائش کا خیال دامن گیر ہو جاتا ہے اور وہ اپنے لباس' وضع قطع اور ہیئر سٹائل کا خیال رکھنے میں مگن ہو جاتا ہے۔ جوانی کی اس کیفیت سے نکلتا ہے تو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور اپنی الگ شناخت بنانے کی تگ و دو میں لگ جاتا ہے' جسے یہاں ''تفاخر بینکم'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جب بڑھاپا آتا ہے تو مال و اولاد کی بہتات اور ہوسِ زر میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میرا بینک بیلنس زیادہ سے زیادہ ہو۔ اس عمر میں وہ اولاد کو اپنا اصل سرمایہ تصوّر کرتا ہے۔ آخر کار اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ اس دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو جاتا ہے۔ یوں دنیا میں بھی اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا اور آخرت میں بھی وہ نقصان میں رہتا ہے۔ عقلمند آدمی وہی ہے جو اپنے ان فطری تقاضوں کے ہوتے ہوئے

آخرت کو مطلوب و مقصود بنا کر زندگی گزارتا ہے اور اس دنیا کی رنگینیوں اور زینت میں کھونے کے بجائے اپنے ربّ کے احکامات کے مطابق اپنی زندگی گزارتا ہے۔

اسی آیت میں آگے کھیتی کی مثال دی گئی ہے کہ انسان دیکھتا ہے کہ کس طرح بیج سے کونپلیں نکلتی ہیں' پھر وہ فصل جوان ہو کر لہلہاتی ہے اور بالآخر زرد ہو جاتی ہے تو فصل کاٹ لی جاتی ہے اور پیچھے چورا رہ جاتا ہے۔ دراصل انسانی زندگی کا سائیکل اور ایک فصل کا عرصۂ حیات آپس میں بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ نوعیت کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف وقت کا ہے کہ انسانی زندگی کا یہ سائیکل اوسطاً پچاس پچپن برس پر محیط ہے' جبکہ فصل کی زندگی کم و بیش چھ ماہ ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے دنیا کی زندگی دھوکے کا سامان ہے کہ انسان اسی زندگی کو اصل سمجھتا ہے اور یہاں کے فائدے کو حقیقی فائدہ سمجھتا ہے اور اس دنیا میں رہتے ہوئے اس کا خیال موت اور آخرت کی طرف منتقل نہیں ہوتا' جبکہ قرآن فصل کی مثال کے ذریعے انسان کو غور و فکر کی دعوت دے رہا ہے کہ جس طرح یہ فصل عارضی ہے اسی طرح تمہاری زندگی بھی عارضی ہے۔ لہٰذا اس عارضی زندگی کے بجائے آخرت کی دائمی زندگی کے لئے بھاگ دوڑ کرو' ورنہ موت تمہیں آدبوچے گی اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔

اس رکوع کی آخری آیت (نمبر ۲۵) میں اجتماعی سطح پر مسلمانوں یعنی اُمت مسلمہ کا مقصد حیات بیان کیا گیا ہے کہ تمہاری تگ و دو اور جدوجہد کا رُخ کیا ہونا چاہئے' فرمایا:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝﴾

''ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو (یعنی قواعد عدل) نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ اور ہم نے لوہا نازل کیا' جس میں جنگ کی زبردست قوت ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں' تاکہ اللہ جان لے کہ کون لوگ اس کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے مدد کرتے ہیں۔ بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کی بعثت کا مقصد بتلایا ہے کہ ان کے ذریعے اللہ

تعالیٰ دین حق اور قوانین شریعت عطا کرتا ہے' تا کہ وہ اس دین کے ذریعے لوگوں کے درمیان عدل وقسط قائم کریں۔ لیکن ابلیس اور اس کے پیروکار انسان کو گمراہ کر کے اس عادلانہ نظام سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ اس دین حق کے قیام میں رکاوٹ بنتے ہیں اور باطل استحصالی نظام کو اُن پر مسلّط رکھنا چاہتے ہیں' تا کہ وہ اللہ کی طرف متوجہ نہ ہوسکیں۔ ایسے لوگ انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں کی سرکوبی کے لئے اللہ نے لوہا اتارا ہے۔ یہ حق و باطل کی کشمکش تخلیق آدم سے آج تک جاری وساری ہے۔ اس دنیا میں اللہ کی وفاداری کا دعویٰ کرنے والوں کا امتحان یہی ہے کہ وہ دین حق کے قیام کی جدوجہد میں اپنا جان و مال کھپاتے ہیں یا نہیں۔

آج حق و باطل کا یہ معرکہ اپنے عروج پر ہے۔ اس میں بظاہر ابلیس اور اس کے پیروکاروں کو وقتی طور پر غلبہ حاصل ہے' کیونکہ باطل نظام کے رکھوالوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی مکمل سپورٹ حاصل ہے۔ چنانچہ وہ اپنی مادّی قوت کے بل بوتے پر اپنے باطل نظام کو پورے عالم میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا میں اپنے اس سسٹم کو نافذ کرنے کو انہوں نے نیو ورلڈ آرڈر کا نام دیا ہے۔

نیو ورلڈ آرڈر کا یہ نعرہ دراصل اللہ کے خلاف اتنا بڑا کلمۂ بغاوت ہے کہ پوری تاریخ انسانی میں اللہ کے خلاف اتنی بڑی بغاوت پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ اس زمین پر امریکہ اور اس کے پس پشت یہود کا نظام چلے گا اور اس ابلیسی نظام میں کسی آسمانی کتاب یا اللہ کی رہنمائی کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اگرچہ وہ اپنے اس نظام کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ دنیا کا بہترین نظام ہے' لیکن اس نیو ورلڈ آرڈر کے علمبردار صدر بش کا حال یہ ہے کہ وہ کسی اصول اور ضابطے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اور کہتا یہ ہے کہ ہم تشدد کو روکنے کے لیے جوابی تشدد پر مجبور ہوئے ہیں۔ حالانکہ اس وقت دنیا میں خودکش حملوں کی صورت میں جو تشدد ہے وہ تو اس جبر کی وجہ سے ہے جو اسرائیل نے مشرقِ وسطیٰ میں یا اس کے چیلے چانٹوں نے کشمیر یا دوسرے خطوں میں برپا کر رکھا ہے اور جس کی امریکہ پشت پناہی کر رہا ہے۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ اس جبر کو ختم کیا جائے' لیکن امریکہ اس جبر کو روکنے کے بجائے الٹا اس ظلم

کے جواب میں ہونے والے تشدد کو ختم کرنے کے لیے میدان میں سرگرم عمل ہے۔ دہشت گردی کے خاتمے کے نام پر یہ مہم درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہے' کیونکہ امریکہ اور یہود کو اپنے شیطانی عزائم کی تکمیل میں سب سے بڑا خطرہ عالم اسلام کے دینی غیرت رکھنے والے مسلمانوں سے ہے۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہم مسلمان ہوتے ہوئے بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس مہم میں امریکہ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ چنانچہ اپنے دین اور مذہب سے غداری کا نتیجہ ہے کہ اللہ کی طرف سے سزا کے طور پر ذلت اور مسکنت ہمارا مقدر بن چکی ہے اور ہم حواس باختگی کے عالم میں اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہے ہیں۔ کبھی دینی جماعتوں پر پابندی لگائی جا رہی ہے اور کبھی دین کے سچے خادمین کو پکڑ پکڑ کر دشمنوں کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ یہ ذلت اور رسوائی ہی تو ہے کہ یہ سب کچھ امریکہ کے حکم پر کرنے کے باوجود اس پر مصر ہیں کہ ہم یہ امریکہ کے اشارے پر نہیں کر رہے۔

حق و باطل کی اس کشمکش میں ہمارا امتحان یہ ہے کہ ہم اللہ کے وفادار بن کر اللہ کے دیئے ہوئے نظامِ عدلِ اجتماعی کو قائم کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگاتے ہیں یا نہیں۔ یہ عادلانہ نظام انسانیت کے لیے رحمت کا پیغام اور بہت بڑی نعمت ہے اور قرآن کی تعلیم یہی ہے کہ جو لوگ اس نظام رحمت کے قیام میں رکاوٹ بنیں انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اہل ایمان میدان میں آ جائیں' کیونکہ ایسے لوگ انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ یہ ملک اسلام کے نام پر قائم ہوا لیکن قرآن سے دوری کے باعث آج پوری قوم دولت اور اقتدار پرستی میں مبتلا ہے۔ جب تک ہم اپنا قبلہ درست نہیں کریں گے ہمارے حالات بہتر نہیں ہوں گے اور ہم یونہی غیروں کی کاسہ لیسی کرتے ہوئے اپنے بھائیوں کے خون سے ہاتھ رنگتے رہیں گے۔ لیکن اگر ہم اللہ کے وفاداروں کی فہرست میں شامل ہونے کے لیے اسی پر توکل اور بھروسہ کرتے ہوئے پہلے اپنے ملک اور پھر کل روئے ارضی پر دین حق کے نفاذ کے لیے کمر بستہ ہو جائیں تو اللہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔ (مرتب: فرقان دانش خان)

درس ۷

'اطاعتِ امر'

بمقابلہ

'تنازُع فی الامر'

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم ..... امّا بعدُ:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ..... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا﴾ (النساء:۵۹)

﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ (الانفال:۴۶)

﴿وَلَقَدْ صَدَقَکُمُ اللّٰہُ وَعْدَہٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَھُمْ بِاِذْنِہٖ ۚ حَتّٰٓی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىکُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْکُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَۃَ ۚ ثُمَّ صَرَفَکُمْ عَنْھُمْ لِیَبْتَلِیَکُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْکُمْ ۭ وَاللّٰہُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (آل عمران:۱۵۲)

﴿یَقُوْلُوْنَ ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ ۭ.....﴾

(آل عمران:۱۵۴)

تک'' تا حد استطاعت۔ اللہ کا تقویٰ تو دین کی روح ہے۔ اور اس کا جو نظام بنے گا وہ ہوگا سمع وطاعت کا نظام کہ ﴿ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا ﴾ سنو اور بس اطاعت کرو۔ اور اس کے لئے انفاق کی ضرورت ہے۔ یہ تینوں چیزیں سورۃ التغابن میں ایک ساتھ ذکر ہوئی ہیں کہ ﴿ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاَنْفِقُوْا ﴾ ''اور (التزام کے ساتھ) سنو اور (بلا چون و چرا) اطاعت کرو اور انفاق کرو''۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ انفاق دو طرح کا ہے' انفاقِ مال اور بذلِ نفس۔ یہ بات سورۃ الحدید کی ابتدائی آیات میں واضح ہو جاتی ہے۔ تو اب بات گویا پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی کہ روحِ دین اللہ کا تقویٰ ہے اور نظامِ دین سمع وطاعت ہے اور اس نظام کے تحت انفاقِ مال اور بذلِ نفس مطلوب ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو اِس حدیث نبویؐ میں مذکور ہے جو حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: التزامِ جماعت' سمع وطاعت' ہجرت اور جہاد''۔

نوٹ کیجئے کہ اس میں تیسری بات ''طاعت'' ہے اور ہم یہ بات پوری تفصیل سے سمجھ چکے ہیں کہ اس کے لئے بیعت کا نظام لازم ہے' جو قرآن وسنت سے منصوص اور ماثور ہے اور یہ نظامِ بیعت ہماری پوری تاریخ میں معمول بہ رہا ہے۔ ہر اجتماعیت اسی کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ ڈھیلی سے ڈھیلی اجتماعیت بھی جو خالص انفرادی اصلاح کے عنوان سے قائم ہوئی' وہ بھی بیعت کے عنوان سے قائم ہوئی' حکومت بنی تو بیعت کے تحت بنی' حکومت سے بغاوت کی نوبت آئی تو بیعت کی بنیاد پر آئی۔ ہماری پوری تاریخ میں یہی نظر آتا ہے' لہٰذا اس کا نظام' نظامِ بیعت سمع وطاعت ہے۔ یہ بیعت سمع وطاعت حضور ﷺ اور دیگر انبیاء و رُسل کے لئے مطلق' غیر مشروط اور غیر مقید ہے' لیکن حضور ﷺ کے بعد ہر شخص کے لئے' خواہ وہ خلافتِ راشدہ تھی خواہ بیعتِ ارشاد ہو' فی المعروف کی شرط کے ساتھ مقید ہے۔ اس کے سوا اس نظامِ اطاعت کے حوالے سے کوئی فرق نہیں۔ البتہ ایک اور پہلو سے اس میں ایک فرق ہے' جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے' تاکہ اس کی اہمیت بھی سامنے آ جائے اور اس کا صغریٰ کبریٰ بھی پورے طور سے

واضح ہو جائے' اور اس طرح سے انشراحِ صدر ہو جائے۔

اس کے ضمن میں سب سے پہلی آیت جو ہم نے منتخب کی' وہ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾ ''اے اہل ایمان! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اس کے رسول کی اور اپنے میں سے اصحابِ امر کی''۔ بیعت کے سلسلے میں جو حدیث ہم تفصیل سے پڑھ چکے ہیں اس میں الفاظ آئے ہیں: '' وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ '' کہ ہم نہیں جھگڑیں گے اصحابِ امر سے' چاہے جو بھی امیر ہو۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ امارت کا ایک باقاعدہ سلسلہ ہوتا ہے۔ ایک ہی شخص امیر نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ مسلمانوں کے امیر مطلق تھے۔ پھر آپ کہیں کوئی جیش بھیجتے تھے تو کسی کو اس کا امیر بناتے تھے۔ پھر اس جیش میں بھی کوئی ایک امیر نہیں ہوتا تھا' اس کے تابع مختلف دستوں کے کمانڈر ہوتے تھے۔ یعنی کوئی میمنہ پر امیر ہے تو کوئی میسرہ پر' کوئی قلب پر امیر مقرر کیا گیا ہے تو کوئی ہراول دستے پر۔ اسی طرح کوئی پیچھے Reserved Forces پر امیر ہے۔ پھر فوج کے مختلف حصوں کی مزید تقسیم بھی ہو سکتی ہے۔ میمنہ اور میسرہ کے اندر بہت سے دستے اور ان کے الگ الگ کمانڈر ہو سکتے ہیں۔ تو یہ تو ایک سلسلہ ہے' اس لئے ''اولی الامر'' کو جمع کی صورت میں لایا گیا ہے۔

مزید نوٹ کیجئے کہ یہاں اطاعت کی جو تین کڑیاں ہیں' اللہ کی اطاعت' رسول کی اطاعت اور اولی الامر کی اطاعت' ان میں سے پہلی دو کڑیوں کے ساتھ تو فعل امر ''اَطِیْعُوْا'' کی تکرار ہوئی' لیکن تیسری کڑی کے ساتھ نہیں ہوئی۔ ورنہ عام ذہن چاہتا ہے کہ یا تو ایک ہی مرتبہ اَطِیْعُوْا کا لفظ کافی ہے' کیونکہ بریکٹ کے باہر والی قدر بریکٹ کے اندر موجود تمام اقدار سے ضرب کھاتی ہے۔ یا پھر اگر تکرار کی گئی تھی تو ایک لفظ کے اضافے سے کوئی حرج نہیں تھا کہ اولی الامر کے ساتھ بھی لفظ ''اَطِیْعُوْا'' دہرا دیا جاتا۔ لیکن نہیں' جو کچھ ہوا بالحق ہوا' اللہ کی حکمت کی بنیاد پر ہوا۔ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت تو مطلق ہے' جب کہ

اولی الامر کی اطاعت مقید اور مشروط ہے اور پہلی دو اطاعتوں کے تابع ہے۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہئے جو ان الفاظ کی ترکیب کے اندر مضمر ہے' understood ہے۔

اب ذرا توجہ کو لفظ اطاعت پر مرکوز کیجئے! اس کا مادہ ''طوع'' ہے اور طوع بمقابلہ ''کرہ'' کے آتا ہے' جیسے طوعاً و کرہاً عام مستعمل ہے۔ اطاعت کہتے ہیں دلی آمادگی سے کسی کی بات ماننے کو۔ یہی اصل میں مطلوب ہے۔ اگرچہ حدیث میں جو بیعت کے الفاظ ہیں ان میں ساتھ ہی اضافہ کر دیا گیا کہ اگر بطوعِ خاطر ہے فبہا' ورنہ اگر کرہاً ہے تو بھی کرنی پڑے گی۔ حدیث کے الفاظ ہیں: بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ یعنی چاہے تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو' تمہارے بارِ خاطر ہو' تمہاری رائے اس کے حق میں نہ ہو' لیکن چونکہ فیصلہ ہو گیا ہے' صاحب امر نے طے کر دیا ہے اور آپ اسے خلافِ دین ہونا یا شریعت کے کسی واضح حکم کے مخالف ہونا بھی ثابت نہیں کر سکے تو آپ کو وہ فیصلہ ماننا پڑے گا۔ اگرچہ جماعتی نظم میں جو روح درکار ہے' جس سے کامیابی کی ضمانت ہو گی' وہ تو یہ ہے کہ جماعت کی اصل ریڑھ کی ہڈی کے اندر یہ اطاعت اپنی اصل روح کے ساتھ یعنی بطوعِ خاطر ہو رہی ہو۔

اب اس میں جو اصل بات ہے' جسے میں چاہتا ہوں کہ آپ پورے شرح وبسط کے ساتھ سمجھ لیں' وہ یہ ہے کہ اولی الامر کے ساتھ شرط ہے مِنْکُمْ کی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ اولی الامر مسلمان ہونے چاہئیں۔ اب اگر کہیں غیر مسلم زبردستی قابض ہو جائے تو مجبوراً اور اضطراراً تو اس کی اطاعت کی جا سکتی ہے' جیسے بھوک سے مرتا انسان سُوَر یا مردار کھا سکتا ہے' جیسے فرمایا گیا: ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ﴾ (پس جو حالت مجبوری میں ہو تو اس پر [یہ ناپاک چیز کھانے میں] کوئی گناہ نہیں' بشرطیکہ [اس کے کھانے میں] کوئی سرکشی اور حد سے تجاوز نہ ہو)۔ ورنہ اسلام میں اصلاً غیر مسلم کی اطاعت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اس اعتبار سے کراچی کا مقدمۂ بغاوت ہماری گزشتہ دو سو سالہ تاریخ کے اندر روشنی کا ایک عظیم مینار ہے' جہاں ہماری تین عظیم

شخصیتوں نے انگریز کی عدالت میں برملا تسلیم کیا کہ ہاں ہم باغی ہیں اور مسلمان کسی غیر مسلم حکومت کا وفادار نہیں ہے۔

اولوالامر سے اختلاف کی صورت میں لائحہ عمل

اب آپ ایک بات اور سمجھئے کہ یہ نظامِ اطاعت دو طرح کا ممکن ہے۔ ان دونوں کے ضمن میں حکم ہو رہا ہے کہ: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ﴾ یعنی اگر تم کسی چیز کے معاملے میں اختلاف رائے کا شکار ہو جاؤ' تمہارے مابین کسی معاملے میں تنازُع ہو جائے تو اسے لوٹا دو اللہ اور اس کے رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔ اب دیکھئے تنازُع کسے کہتے ہیں۔ یہ نزع سے باب تفاعل ہے۔ نزع کے معنی ہیں کھینچنا۔ جب جان کھینچی جائے گی تو وہ عالم نزع ہے۔ لہٰذا تنازُع کے معنی ہیں کھینچ تان۔ اگر ایک طرف سے کوئی کھینچ رہا ہے اور دوسری طرف سے کوئی دوسرا کھینچ رہا ہے تو یہ تفاعل کے وزن پر تنازع ہے۔ بابِ مفاعلہ کی طرح بابِ تفاعل کے بھی دو خواص مبالغہ اور مشارکہ ہیں۔ یعنی شرکت بھی ہوتی ہے اور مبالغہ بھی ہوتا ہے۔

تو اس آیت میں اسی بات کی طرف راہنمائی کی جا رہی ہے کہ اگر تمہارے مابین یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو اب کیا کرنا ہے! یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کی رائے ہو کہ یہ چیز صحیح ہے اور دوسرے کی رائے ہو کہ نہیں' یہ غلط ہے۔ اب یہاں نوٹ کیجئے کہ میں نے 'صحیح' اور 'غلط' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ صحیح اور غلط کے مختلف درجات ہیں۔ ایک معاملہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کی رائے ہے کہ یہ چیز اَنسب ہے' زیادہ مناسب ہے اور ایک کی رائے ہے کہ یہ کم مناسب ہے۔ معاملہ نصوص کا نہ ہو' حلال و حرام کا نہ ہو' بلکہ صرف تدبیر کا ہو کہ بحالاتِ موجودہ ہمارے لئے کون سا طریقۂ کار موزوں تر ہے؟ ابھی ہم کوئی مزید قدم اٹھانے کی پوزیشن میں ہیں یا نہیں ہیں؟ ایک کا خیال ہو سکتا ہے کہ ہیں اور ایک کا خیال ہو سکتا ہے کہ نہیں ہیں۔ اس بحث کو ایک طرف رکھ دیجئے! یہاں معاملہ نصوص کا ہے۔ جو معاملات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مطلق اطاعت سے متعلق ہوں' یعنی

حلال وحرام' جائز و ناجائز اور صحیح وغلط میں اگر اختلافِ رائے ہو جائے اور تنازع پیدا ہو جائے۔ یہاں وہ حدیث ذہن میں لے آیئے کہ ((اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَبَیْنَھُمَا مُشْتَبِھَاتٌ)) ''حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے' البتہ ان دونوں کے مابین کچھ چیزیں مشتبہ (غیر واضح) ہیں''۔ دین میں جو قطعی حلال وحرام ہیں وہ تو بالکل بیّن ہیں۔ البتہ ان کے مابین مشتبہات کا دائرہ آ جاتا ہے جہاں اصل میں مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ مشتبہات میں بھی آدمی کی رائے میں سختی ہو سکتی ہے۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ یہ چیز حرام سے زیادہ قریب ہے اور کسی دوسرے کی رائے میں یہی چیز حلال سے زیادہ قریب ہے تو دونوں اپنی اپنی رائے پر جازم ہو جائیں گے اور ان کی آراء میں سختی پیدا ہو جائے گی۔ اس کیفیت کو ذہن میں رکھئے! اس کا حکم یہ دیا کہ: ﴿فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ ''لوٹا دو اُس شے کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف''۔ یہ بالکل منطقی سی بات ہے۔ اس لئے کہ غیر مقید' غیر مشروط اور مطلق اطاعت تو صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہے۔

اب دیکھئے' نظم جماعت کی دو علیحدہ علیحدہ شکلیں ہیں' جنہیں سمجھ لینا چاہئے۔ ایک معاملہ ہو سکتا ہے کسی اسلامی ریاست میں حکومت کے ساتھ اس جھگڑے کے پیش آ جانے کا۔ ہم سورۃ الحجرات میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں کہ اسلامی ریاست کا اصل الاصول یہ آیۂ کریمہ ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ''اے اہل ایمان! اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو!'' کیونکہ قرآن وسنت ہی اس کا دستورِ اساسی ہے اور اہل ایمان کے پاس جو بھی قانون سازی کا اختیار ہے وہ ایک دائرے کے اندر محدود ہے۔ چنانچہ پاکستان کے دستور میں بھی یہ شق موجود ہے کہ:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ریاست کا ایک شہری اگر یہ محسوس کرتا ہے کہ جو مسودۂ

قانون اس وقت زیر بحث ہے اس کی کوئی شق یا وہ پورا قانون شریعت کے دائرے سے تجاوز کر رہا ہے' یا یہ کہ جو قانون اس وقت ریاست میں موجود ہے' اس کی رائے کے مطابق (چاہے اس کی رائے صحیح ہو یا غلط) اس میں اللہ اور اس کے رسول کے دائرے سے تجاوز ہے' تو اس صورت میں اس کا کیا حل ہوگا؟ اس کی وضاحت تفصیلاً ہو چکی ہے کہ الحمد للہ' ثم الحمد للہ کہ اس دَور میں جو ادارے (institutions) وجود میں آئے ہیں اور جو عمرانی ارتقاء ہوا ہے اس نے ریاست کے تین بنیادی organs کو علیحدہ علیحدہ متعارف کرایا ہے۔ ایک قانون ساز ادارہ (Legislature) ہے' ایک انتظامیہ (Executive) ہے اور ایک عدلیہ (Judiciary) ہے۔ تو یہ معاملہ عدالت کے حوالے ہوگا۔ جیسے دستور کی جو دوسری provisions ہیں' ان سب کی امین (custodian) عدلیہ ہے۔ مثلاً اگر کسی کے بنیادی حقوق میں کمی کی گئی ہے تو وہ کہاں جائیں گے! عدالت ہی کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ اسی طرح جب ریاست کے دستورِ اساسی میں یہ طے ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی تو اختلاف کی صورت میں آپ عدالت ہی کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ آپ کے خیال میں اگر کوئی عمل قرآن وسنت کے خلاف ہو رہا ہے' ممکن ہے آپ کو مغالطہ ہو' لیکن یہ کہ آپ کے لئے راستہ تو یہی ہے کہ جو بھی اعلیٰ عدالتیں ہیں ان کا دروازہ کھٹکھٹائیں! وہاں علماء کو بھی بحث اور استدلال کا موقع ہے کہ وہ عدالت میں جائیں اور دلائل دے کر ثابت کریں کہ یہ صرف مغالطہ تھا یا بات واقعی صحیح تھی۔ یہ ہے صورت جو اسلامی ریاست کے اندر اس دَور میں اختیار کی جائے گی۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ نبی اکرم ﷺ کے اندر تو دیگر ہزاروں حیثیتوں کے ساتھ یہ تینوں حیثیتیں بھی جمع تھیں۔ صدرِ ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ ہی چیف جسٹس بھی تھے' حضور ﷺ ہی چیف ایگزیکٹو بھی تھے اور قانون سازی بھی حضور ﷺ ہی کے ہاتھ میں تھی۔ آپ تو خود شارع ہیں۔ شارع اوّل اللہ تعالیٰ اور شارع ثانی محمد رسول اللہ ﷺ۔ تو یہ تینوں حیثیتیں حضور ﷺ کی ذات میں

جمع تھیں۔ اسی کا عکس آپ کو خلافت راشدہ میں نظر آئے گا' اگرچہ ذرا آگے چل کر اس میں تقسیم شروع ہوئی ہے۔ غالباً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں علیحدہ عدالتی نظام قائم ہوا ہے' ورنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کوئی علیحدہ عدالتی نظام نہیں تھا اور خلیفۂ وقت چیف جسٹس بھی تھا۔ ان چیزوں کے بارے میں لوگوں کو مغالطے لاحق ہو گئے ہیں۔ وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ کیفیت ہمیشہ کے لئے واجب العمل (binding) ہے اور وہ تمدنی ارتقاء کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں بڑے بڑے لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ نظامِ خلافت راشدہ دراصل نظامِ دورِ نبوت کا تتمہ اور اس کا عکس ہے اور یہ حیثیت آئندہ کسی بھی نظامِ حکومت کو حاصل نہیں ہو سکتی' اس لئے کہ حضور ﷺ نے اس کے نظائر کو ہمارے لئے binding قرار دے دیا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) (ابوداؤد' ابن ماجہ' احمد) ''پس تم پر لازم ہے کہ میرا طریقہ اور ہدایت یافتہ خلفاءِ راشدین کا طریقہ اختیار کرو''۔ اب کسی اعلیٰ سے اعلیٰ اسلامی حکومت کا بھی تاقیامِ قیامت یہ مقام نہیں ہوگا۔ خلافت راشدہ تو اصل میں تتمہ اور نمونہ ہے دورِ نبوت کا۔ بہرحال یہ اولی الامر کا معاملہ اس طور سے اسلامی ریاست میں حل ہوگا۔

نظم جماعت کی دوسری صورت ایک اسلامی جماعت کی ہے۔ بالفرض ریاست قائم نہیں ہے اور اس کے قیام کی جدوجہد کے لئے ایک جماعت قائم ہوئی ہے تو اس میں جو اولی الامر ہوں گے ان کے ساتھ معاملہ کس طور سے ہوگا؟ اب اس میں بھی دیکھئے کہ ایک تو وہ شخص ہے جس کے ہاتھ پر آپ نے بیعت کی ہے۔ وہ آپ کا امیر اوّل ہے' وہ داعی اوّل ہے۔ اس نے پکارا ہے مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہ۔ آپ اس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے جمع ہو گئے۔ اس کے ہاتھ پر آپ نے بیعت سمع و طاعت فی المعروف کی ہے۔ اب اس کے نیچے امراء کا ایک نظام ہے اور امراء کی ایک لمبی زنجیر ہے۔ جتنی بڑی وہ جماعت ہوگی اور اس جماعت کا جتنا پھیلاؤ ہوگا اتنی ہی وہ لمبی زنجیر بنتی چلی جائے گی۔ اب یہاں پر اگر تدبیر کے معاملے میں آپ کا کوئی اختلاف ہوگا تو

آپ صرف اپنی رائے پیش کر کے آزاد ہو جائیں گے۔ اب اس پر جو فیصلہ صاحب امر کرے گا آپ کو اسے تسلیم کرنا ہوگا' چاہے آپ اسے فِی الْمَنْشَطِ قبول کریں اور چاہے فِی الْمَکْرَہِ۔ اب یہاں تک تو کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوگا جب ایک شخص کا خیال ہو کہ یہ تو شریعت کی حدود سے تجاوز ہو رہا ہے۔ اب اس صورت میں یہ ہوگا کہ اگر تو یہ زیریں اطاعتیں ہیں' یعنی اصحابِ امر امیر اوّل سے نیچے والے ہیں تو آپ کو ایک لائن آف اپیل میسر ہے۔ آپ اس امیر سے بالاتر امیر کے پاس اپیل کریں گے۔ اور اگر آپ کو اس سے بھی اختلاف ہے تو اس سے بالاتر کے پاس جائیں گے۔ آپ کو through proper channel اس بات کو امیر اوّل تک پہنچانا ہوگا۔ اس میں کوئی شخص اپنے آپ کو آخری فیصلہ کرنے والا متصور نہ کرے۔ فرض کیجئے کہ بات آخری امیر یعنی امیر اوّل تک پہنچ گئی اور آپ اس کی ذات سے بھی مطمئن نہیں ہوئے تو آپ کے لئے راستہ بالکل کھلا ہوگا کہ آپ اس سمع و طاعت کی بیعت کا قلادہ گردن سے نکال کر پھینک دیں۔

ریاست اور جماعت میں یہی بنیادی فرق ہے کہ ریاست کی علاقائی حد بندی (Territorial Jurisdiction) ہوتی ہے' آپ اس سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتے۔ یہاں جو بھی نظام قائم ہے آپ طوعاً یا کرہاً اس کے رکن ہیں' جب کہ جماعت کا کوئی علاقائی تسلط نہیں ہوتا۔ آپ فوراً ہی جماعت سے الگ ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے آپ کو نہ شہر اور گاؤں چھوڑنا پڑتا ہے اور نہ ملک چھوڑنا پڑتا ہے۔ آپ نے جماعت کا ایک نظم اختیار کیا تھا جو ایک معنوی نظم ہے' علاقائی نظم نہیں ہے۔ کسی شخص کی اصابت رائے پر آپ کو اعتماد ہوا تھا تو آپ فکری ہم آہنگی کی بنا پر جماعت میں شامل ہوئے تھے' کسی شخص کے خلوص و اخلاص پر آپ کے دل نے گواہی دی تھی تو آپ شامل ہوئے تھے' کسی شخص کی عزیمت اور ہمت پر آپ کو اعتماد ہوا تھا تو آپ شامل ہوئے تھے۔ اگر آپ کے نزدیک اب ان میں سے کوئی چیز نہیں رہی تو آپ کے لئے راستہ کھلا ہے' آپ آنِ واحد میں علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ یہ ہے اصل فرق جسے لوگ نہیں سمجھتے۔ یعنی ریاست کے لئے

فیصلے میں Judiciary سے رجوع کیا جائے گا۔ اور جماعت میں امکان بھر کوشش کیجئے کہ اس بات کو through proper channel آگے تک پہنچایئے! لیکن بہر حال کہیں نہ کہیں جا کر تو بات رکے گی! کہیں پر جا کر تو وہ زنجیر بند ہو گی اور بات آخری امیر تک پہنچے گی! لہٰذا وہاں جا کر آدمی کو فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اگر اس کا دل مطمئن نہیں ہے تو وہ کیسے چل سکتا ہے! تدبیر کے معاملے میں اگر دل مطمئن نہیں ہے تو اس کو چلنا چاہئے۔ لیکن اگر نصوص کے بارے میں دل مطمئن نہیں رہا تو اب اس کا چلنا ضروری نہیں ہے۔ وہ اس اطاعت کے قلادے کو اتار پھینکے۔ اس کے لئے یہ راستہ کھلا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا﴾ ''یہی بہتر ہے اور انجام کار کے اعتبار سے صحیح طریقہ ہے''۔ اس میں لفظ ''تاویل'' کا مفہوم سمجھ لیجئے۔ اٰلَ یَـؤُوۡلُ کا مطلب ہے کسی چیز کسی مرکز کی طرف لوٹنا۔ اسی سے لفظ آل بنا ہے جس میں ایسے تمام لوگ ہوتے ہیں جو کسی بڑی شخصیت کی طرف اپنی نسبت کریں' اپنے آپ کو اس سے جوڑیں' اس سے تعلق قائم کریں' کسی معاملے میں اس کی طرف رجوع کریں۔ وہ سب گویا اس کی آل ہیں۔ اس معنی میں ''آلِ محمد'' پوری اُمت ہے۔ جو بھی حقیقت کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جڑا ہوا ہے وہ آپ ﷺ کی آل میں شامل ہے۔ تو اٰلَ یَـؤُوۡلُ کے باب تفعیل میں تاویل بنا ہے جس کے معنی ہیں لوٹانا' کسی چیز کو رجوع کرانا۔ یعنی اگر اپنی جدوجہد کو کامیابی اور نتیجہ خیزی کی طرف لوٹانا چاہتے ہو تو اس کا یہ راستہ ہے' جو بہت بہتر اور سب سے عمدہ اور خوبصورت شکل ہے لوٹنے کی اور اپنے معاملے کو لوٹانے کی۔ کیونکہ آیت میں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ﴾ تو یہ اس کی ظاہری شکل اور کامیابی کی طرف لوٹنا ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی بیعت کی متفق علیہ حدیث کی ایک روایت میں: ''وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ'' کے بعد ان الفاظ کا اضافہ ہے: ''اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ مِنَ اللّٰہِ فِیْہِ بُرْھَانٌ''۔ یہ الفاظ حضور ﷺ نے ارشاد فرمائے ہوں گے' اس لئے کہ یہاں صیغہ بدل گیا ہے۔ ان الفاظ میں حضور ﷺ نے

گویا ایک مضمر شے کو نمایاں فرمایا: ''سوائے اس کے کہ تم کھلم کھلا کفر کا مشاہدہ کرو جس کے ضمن میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے برہان ہو (دلیل اور سند ہو)۔ کوئی بھی محض اپنے ذاتی خیال اور وجدان کی بنیاد پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں حدودِ شریعت سے تجاوز ہو رہا ہے' بلکہ یہاں تو واضح دلیل اور سند کی ضرورت ہے۔ ورنہ تو نظم کہاں رہا! پھر تو سمع و طاعت کی روح غائب ہو گئی! سمع و طاعت کے پورے نظام کی چولیں ہل جائیں گی۔

تنازُع کی ممانعت اور اس کے ممکنہ نتائج

اب آگے چلئے! سورۃ الانفال (آیت ۴۶) میں فرمایا: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی''۔ اب یہاں اَطِیْعُوْا کا لفظ رسول کے ساتھ بھی نہیں دہرا کر لایا گیا۔ اس لئے کہ الفاظ کے استعمال میں بھی قرآن مجید میں لفاظی نہیں ہے' کم سے کم جچے تلے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہاں چونکہ امراء کے اِس سلسلے کو نمایاں کرنا اور اس میں فرق و تفاوت کو واضح کرنا مقصود نہیں تھا' لہٰذا ایک ہی بار ''اَطِیْعُوْا'' لایا گیا۔ اور قرآن میں ہمیشہ ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ'' ہی آتا ہے کہ ''اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو''۔

رسول اللہ ﷺ کی جملہ حیثیتوں میں ایک حیثیت مدنی دَور میں یہ بھی تھی کہ آپ ﷺ حاکم یعنی چیف ایگزیکٹو اور چیف جسٹس بھی تھے اور قانون سازی کا سارا اختیار بھی آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھا۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے کچھ چیزیں حرام کی ہیں اور میں نے بھی کچھ چیزیں حرام کی ہیں۔ یہاں میں آپ ﷺ کی جس حیثیت کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں وہ قبل از ہجرت کی حیثیت ہے۔ اس وقت مکّہ میں آپؐ کی حکومت نہیں تھی' کوئی علاقائی تسلط آپؐ کو حاصل نہیں تھا۔ مکّے میں تو آپ ﷺ مغلوب تھے' کمزور تھے۔ اگرچہ بظاہر الفاظ مناسب نہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ کفر کو غلبہ حاصل تھا' کفار و مشرکین کے ہاتھ میں اختیار تھا' صحابہ کرامؓ کو اذیتیں دی جا رہی تھیں اور ان کی دادرسی کا بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس حالت میں تو دراصل مسلمان ایک

جماعت تھے' جس کے امیر محمد رسول اللہ ﷺ تھے۔ رسول ہونے کی حیثیت تو بلاشبہ تمام حیثیتوں سے بالاتر ہے۔ اسی لئے اس حیثیت کو قرآن میں نمایاں کیا گیا ہے جو سب سے اعلیٰ' سب سے اہم اور سب سے بلند ہے۔ لیکن سیرت النبیؐ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر جگہ پر دیکھئے کہ حضور ﷺ کس حیثیت سے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ کہیں آپؐ صرف منصف کی حیثیت سے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ رسول کی حیثیت سے تو آپؐ سے خطا کا کوئی امکان نہیں ہے' لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ منصف کی حیثیت سے مجھ سے خطا ہو سکتی ہے۔ ایک حدیث کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ لوگو! تم میرے پاس اپنے مقدمات لے کر آتے ہو' کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق زیادہ چرب زبان ہے' اپنی بات کو دلیل کے ساتھ زیادہ زوردار انداز میں پیش کر سکتا ہے' جبکہ دوسرا بیچارہ اس پہلو سے عاجز ہے' تو وہ چرب زبان مجھ سے غلط فیصلہ کروا لیتا ہے۔ تو جان لو کہ میری عدالت سے بھی اگر تم کوئی غلط ڈگری لے گئے اور کسی زمین کے ٹکڑے کے بارے میں تم نے غلط فیصلہ حاصل کر لیا تو جان لو کہ وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہو گا جو تم لے کر جاؤ گے۔ کس قدر واضح حدیث ہے کہ بحیثیت منصف خطا ہو سکتی ہے۔ وہ تو صرف رسول کی حیثیت ہے جو خطا سے پاک ہے' منزہ ہے' معصوم ہے۔

غزوۂ بدر میں آپ ﷺ نے ایک مقام بتایا کہ یہاں پڑاؤ کیا جائے۔ صحابہ نے کہا کہ حضورؐ! اگر تو یہ وحی کا فیصلہ ہے' یہ آپ کا بحیثیت رسول امر ہے تو سرِ تسلیم خم ہے' ہماری عقلیں وحی کے مقابلے میں عاجز ہیں' ناقابل التفات ہیں۔ لیکن اگر معاملہ یہ نہیں ہے تو اجازت دیجئے کہ ہم عرض کریں! جب اجازت مل گئی تو صحابہ نے عرض کیا کہ حضورؐ! جنگی مہارت اور جنگی علم و فہم کے اعتبار سے ہم عرض کر رہے ہیں کہ یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ حضورؐ نے اسے تسلیم کر لیا اور پڑاؤ وہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ ڈالا جہاں صحابہؓ نے مشورہ دیا تھا۔ تو اگر ان تمام حیثیتوں کو علیحدہ علیحدہ نہیں رکھا جاتا تو آدمی مغالطے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تو یہاں فرمایا: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور جھگڑا مت کرو''۔ اب یہاں

لفظ تنازُع آ گیا کہ جھگڑا مت کرو' کھینچ تان مت کرو۔ اگر یہ کرو گے تو کیا ہو گا؟ ﴿فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ﴾ ''تو تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی''۔ 'فَشَلَ' کا مطلب ہے کسی چیز کا ڈھیلا پڑ جانا۔ میں نے ''کسا ہوا نظم'' کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ اس کے مقابلے میں ''ڈھیلا نظم'' ہے۔ یعنی اب اس کا چاک و چوبند والا معاملہ نہیں رہا۔ بعض تراجم میں 'فَتَفْشَلُوْا' کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ ''تم نامرد ہو جاؤ گے''۔ اس لفظ کی اس حوالے سے بڑی مناسبت ہے۔ یہاں نظم کا ڈھیلا پڑنا مراد ہے جس کی طرف یہاں اشارہ ہو رہا ہے کہ اگر تم نے کھینچ تان شروع کر دی' اگر یہ تمہاری عادتِ ثانیہ بن گئی تو تمہاری ہمت ختم ہو جائے گی' تم پر نامردی سوار ہو جائے گی اور تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے۔ اور اس کا ایک اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ ﴿وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ﴾ ''اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی''۔ یعنی کفار و مشرکین پر سے تمہاری دھاک ختم ہو جائے گی' تمہارا رعب اور دبدبہ ختم ہو جائے گا۔ یہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا نتیجہ نکل رہا ہے۔ یہ گویا کہ اب اس تنازُع کی منفی کیفیت ہے جس سے یہ نتائج رونما ہوں گے۔ اور یہ جان لو کہ اصل میں جماعتی نظم کا ڈھیلا پڑنا اس مقصد کو نقصان پہنچانے کا سبب بن جائے گا جس کے لئے جماعت قائم ہوئی تھی۔ جماعت تو کسی مقصد کے لئے قائم ہوتی ہے۔ جماعت بذاتہٖ تو مطلوب نہیں ہے۔ وہ فی نفسہٖ مطلوب شے نہیں ہے' کسی مقصد کے لئے ہے۔ تو تمہارا ڈھیلا پڑ جانا اور تمہاری ہوا کا اکھڑ جانا' اس کا نقصان اس مقصدِ عظیم کو پہنچے گا جس کے لئے تم نے وہ اجتماعیت اختیار کی اور اسے قائم کیا۔

آگے فرمایا: ﴿وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ ''اور صبر کرو (ڈٹے رہو' جمے رہو) یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ اس میں صبر کا ایک پہلو اور بھی ہے کہ اطاعت امر کے لئے صبر کی ضرورت ہے۔ ایک صبر ہے مخالفین کے مقابلے میں ڈٹے رہنا اور ایک صبر ہے ایذاء پر۔ لیکن صبر علی الطاعۃ اور صبر عن المعصیۃ بھی تو صبر کی قسمیں ہیں۔ معصیت سے اپنے آپ کو روکنا' نافرمانی سے روکنا یہ بھی تو

صبر ہے اور اطاعت پر کاربند رہنا بھی صبر ہے۔ اس صبر علی الطاعۃ اور صبر عن المعصیۃ کے لئے بھی وہی chain ہوگی' یعنی اللہ کی اطاعت پر صبر اور اللہ کی معصیت سے صبر' رسول کی اطاعت پر صبر اور رسول کی نافرمانی سے صبر' اسی طرح اولی الامر کی اطاعت پر صبر اور اولی الامر کی نافرمانی سے صبر۔ ایک چیز سے اپنے آپ کو روکنا صبر ہے اور ایک چیز پر اپنے آپ کو جمانا صبر ہے۔ چنانچہ یہاں دراصل اطاعت پر صبر کا حکم ہے۔ اور اطاعت میں وہی تین کڑیاں پیش نظر رہیں گی: ﴿اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی' اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی''۔ اگرچہ لفظ ''صبر'' عام ہے لیکن درحقیقت یہ اسی صبر علی الطاعۃ کی طرف اشارہ ہے۔ اور اسی کی منفی شکل ہے صبر عن المعصیۃ۔ اطاعت اور معصیت پر صبر کا اوّلین استحقاق اللہ کا ہے' اس کے بعد رسول ﷺ اور پھر تیسرے درجے میں آتے ہیں وہ صاحب امر جو اہل ایمان میں سے ہوں۔

غزوۂ اُحد میں تنازع فی الامر کا نتیجہ

اب اگر اس آیت کے ساتھ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۵۲ کو جوڑ لیا جائے تو مضمون نکھر کر سامنے آ جائے گا۔ یوں سمجھئے کہ غزوۂ اُحد کا واقعہ مذکورہ بالا آیت کی ایک مثال ہے۔ یہ اس درس میں بہت اہم آیت ہے۔ یہاں غزوۂ اُحد کے حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو بڑی زک پہنچی' شدید نقصان ہوا' ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے' حضور ﷺ خود مجروح ہوئے' آپ ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے' چہرۂ مبارک لہولہان ہوا۔ ''وَتَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ وَعَصَیۡتُمۡ'' والی بات بھی ہوئی اور ''فَفَشِلۡتُمۡ'' والی بات بھی ہوئی۔ یہ سارے نتائج نکلے ہیں۔ لہٰذا ایک عملی مثال سے اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ سمجھ لیا جائے! اب اللہ تعالیٰ تبصرہ فرما رہے ہیں کہ اے مسلمانو! ذرا غور کرو' ذرا نگاہِ بازگشت ڈالو اور سوچو کہ ایسا کیوں ہوا۔ کیا ہم نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا تھا؟ کیا ہمارا نصرت کا وعدہ غلط تھا؟ کیا ہمیں کافروں سے محبت ہو گئی تھی؟ کیا ہم نے تمہارے مقابلے میں اُن سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا؟ کیا تمہیں ہم نے

وداع کر دیا تھا؟ تم سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا؟ 'وداع' کا لفظ جو میں نے استعمال کیا ہے اس کا تعلق سورۃ الضحیٰ سے ہے' جس میں آپ ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے: ﴿مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی﴾ ''آپ کے ربّ نے نہ آپ کو چھوڑا نہ وہ آپ سے ناراض ہوا''۔ وہ ابتدائی مکی دَور ہے' اس میں صیغۂ واحد میں گفتگو ہو رہی ہے۔ یہاں یہی سمجھئے کہ "مَا وَدَّعَکُمْ رَبُّکُمْ" کہ تمہارے ربّ نے تمہیں چھوڑا نہیں ہے۔ تمہارا ربّ تم سے کنارہ کش نہیں ہوا۔ اس میں سے کوئی چیز نہیں ہوئی۔ تو اب سمجھو کہ ہوا کیا ہے؟

فرمایا جا رہا ہے: ﴿وَلَقَدْ صَدَقَکُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ﴾ ''اور اللہ نے تو تم سے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا جب کہ تم انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے اللہ کے حکم سے''۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ ذہن میں رہے کہ تم سے وعدہ خلافی نہیں ہوئی ہے۔ ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ ''اللہ سے بڑھ کر سچی بات کرنے والا کون ہے؟'' اور ﴿وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ ''اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا وفا کرنے والا کون ہوگا؟'' تو وعدہ خلافی تو قطعاً نہیں ہوئی' بلکہ اللہ نے اپنے وعدہ پورا کر دیا تھا۔ اہل ایمان کو پہلے ہی ریلے میں فتح حاصل ہو گئی تھی۔ کفار بڑے لاؤ لشکر اور سامان کے ساتھ آئے تھے۔ کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کی نسبت پہلے ہی ایک اور تین کی تھی اور اب منافقین کے واپس چلے جانے کے بعد ایک اور چار کی ہو چکی تھی' اس کے باوجود اللہ کا وعدہ صد فیصد درست ثابت ہوا' لیکن یہ واضح فتح شکست میں کیوں بدلی' اس کو ذرا سمجھو! فرمایا: ﴿حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ﴾ ''یہاں تک کہ جب تم ڈھیلے پڑے (تم نے نظم کو ڈھیلا کر دیا) اور تم نے امر میں جھگڑا کیا (کھینچ تان کی)''۔ اب دیکھئے سورۃ الانفال کی آیت ۴۶ والے الفاظ ہی یہاں آ رہے ہیں۔ یہ بہت اہم الفاظ ہیں۔ میں نے اسی لئے آج وضاحت میں ''نظم کو ڈھیلا کرنا'' اور ''تنازع'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں' تاکہ ایک شے کی حقیقت کھل کر سامنے آئے۔ اسے فقہ اللغۃ کہتے ہیں کہ لغت کے اندر بصیرت کا حاصل ہو جانا۔ یعنی ایک لفظ کا مفہوم' اس کی مراد' اس کے مجازی معنی اور اس کے حقیقی معنی کو سمجھنا۔ ہر لفظ کا ایک باطن ہوتا ہے' اسے سمجھ

لینے سے بصیرتِ باطنی پیدا ہوتی ہے۔

یہاں یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ سورۃ الانفال غزوۂ بدر کے بعد اور غزوۂ اُحد سے پہلے نازل ہوئی ہے جس کی آیت ۴۶ کا ہم نے مطالعہ کیا ہے۔ وہاں مسلمانوں کو پیشگی حکم دیا گیا تھا کہ: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی اور جھگڑا مت کرو!'' اور پیشگی تنبیہہ بھی کر دی گئی تھی: ﴿فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ﴾ ''ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی''۔ یعنی ایسا بھی نہیں ہوا کہ پیشگی متنبہ نہ کیا گیا ہو۔ لیکن پھر تم نے (غزوۂ اُحد کے موقع پر) نظم کو ڈھیلا کیا اور امر میں جھگڑا کیا' کھینچ تان کی۔ یہ کس کا امر تھا جس میں جھگڑا ہوا اور کھینچ تان ہوئی؟ اسے بھی تنقیح کے ساتھ سمجھ لیجئے۔ اصلاً تو امر محمد رسول اللہ ﷺ کا تھا جو اُس وقت سپہ سالارِ اعلیٰ ہیں۔ یہ کوئی نص کا معاملہ نہیں تھا' بلکہ تدبیر سے متعلق معاملہ تھا کہ اس درے سے یہ پچاس تیر انداز ہرگز نہ ہٹیں۔ لیکن اپنی بات کی تاکید کے لئے حضور ﷺ کی زبان مبارک سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے کہ ''خواہ تم یہ دیکھو کہ ہم سب شہید ہو گئے ہیں اور پرندے ہماری بوٹیاں نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم یہاں سے مت ہٹنا''۔ یہ انتہائی تاکیدی الفاظ ہیں۔ اب وہاں پچاس افراد ہیں اور ان کا ایک کمانڈر ہے۔ اب صورتِ واقعہ یہ ہے کہ رسولؐ وہاں موجود نہیں ہیں۔ اب صورت یہ ہوئی کہ فتح ہو گئی۔ اب تاویل کا اختلاف ہو گیا۔ اکثر تیر اندازوں نے کہا کہ اب تو فتح ہو گئی' کس لئے یہاں کھڑے ہو' چلو یہاں سے! جبکہ ان کا کمانڈر انہیں روک رہا ہے کہ دیکھو رسولؐ کے حکم کو یاد کرو۔ لیکن ان کا موقف یہ تھا کہ وہ حکم تو اُس وقت تھا اگر شکست ہوتی' سب مارے جاتے' سب شہید ہو جاتے۔ اب تو فتح ہو گئی ہے' یہ حکم اب یہاں پر نافذ نہیں ہو رہا ہے۔ اب پہلے درجے میں یہ دیکھئے کہ یہ نص کا نہیں' بلکہ تدبیر کا معاملہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس تدبیر کے معاملے میں بھی معصیت صریحہ نہیں ہے' بلکہ تاویل ہے۔ اس تاویل کی وہ مثال بھی ذہن میں رکھئے گا کہ ''عصر کی نماز نہ پڑھنا جب تک بنو قریظہ کے ہاں نہ پہنچ جاؤ''۔ اس کی دونوں تاویلیں ہوئیں۔ ایک تاویل یہ ہوئی کہ

عصر کی نماز سے پہلے پہلے بنو قریظہ تک پہنچنا لازمی ہے اور دوسری یہ کہ بنو قریظہ کے ہاں پہنچ کر ہی عصر کی نماز پڑھنی ہے۔ اور دونوں کو حضور ﷺ نے مساوی قرار دیا۔ تو یہ تاویل کی بات ہے۔ لیکن اب تیسرے درجے پر آیئے! اگر کمانڈر یہ تاویل قبول کر لیتا تو یہ تاویل کی بات ہو جاتی' لیکن کمانڈر نے قبول نہیں کی تو اب لازماً کمانڈر کا حکم چلے گا۔ یہاں معاملہ نظم کا ہے۔ جسے امیر بنایا گیا تھا تاویل تو اس کی چلنی تھی نہ کہ مامورین کی۔ لہٰذا معصیت ہوئی تو اس کمانڈر کی۔

یہاں میں نے معاملے کو کتنا dilute کر دیا۔ یہاں معاذ اللہ' اللہ کے حکم کی یا رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ یہاں معاملہ نصوص کا نہیں' تدبیر کا ہے اور تدبیر میں بھی کھلم کھلا سرتابی نہیں ہے' بلکہ تاویل ہے۔ تاویل اگر کمانڈر کی ہوتی تو یہ غلطی نظر انداز ہو جاتی۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نظر انداز فرما دیتا۔ لیکن وہاں نظم ٹوٹا ہے' کمانڈر کا حکم نہیں مانا گیا اور ۳۵ تیر انداز وہاں سے چلے گئے' ۱۵ رہ گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اصلاً مطلوب یہ ہے کہ اس کا تجزیہ کر کے' تنقیح کر کے اچھی طرح سمجھ لیجئے۔

مؤمن کا نصب العین۔ رضائے الٰہی اور فلاحِ اخروی

آگے فرمایا: ﴿وَعَصَيْتُمْ﴾ ''اور تم نے نافرمانی کی''۔ میں صراحت کر چکا ہوں کہ نافرمانی اللہ اور اس کے رسول کی نہیں' بلکہ کمانڈر کی ہوئی ہے جس پر گرفت کی جا رہی ہے۔ اس لئے کہ بیعت میں یہ بھی کہا گیا ہے: اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ ''کہ ہم اصحاب امر سے نہیں جھگڑیں گے (کھینچ تان نہیں کریں گے)'' اب گویا تم نے اس میں معصیت کی ﴿مِّنْ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾ ''اس کے بعد کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھا دی جو تمہیں پسند ہے''۔ عام طور پر لوگ اس بارے میں مغالطے میں مبتلا ہیں کہ اس سے مراد مالِ غنیمت ہے۔ یہ مالِ غنیمت والی بات تو بالکل ہی غلط ہے۔ اس لئے کہ مالِ غنیمت کا مسئلہ اس وقت تو ہو سکتا تھا اگر غزوۂ بدر کی بات ہوتی' جبکہ ابھی مالِ غنیمت کی تقسیم کا قانون نہیں آیا تھا۔ اُس وقت تک یہ روایت تھی کہ جو بھی شخص جتنا مال بھی جمع

کر لے گا وہ اسی کا ہے۔ تو ہر شخص کے اندر خود بخود ایک urge پیدا ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کر لے۔ اس صورت حال میں کوئی شخص سوچ سکتا تھا کہ ہم یہاں کھڑے رہ گئے تو ہمارے ہاتھ پلّے کچھ پڑے گا نہیں۔ لیکن سورۃ الانفال میں مالِ غنیمت کا حکم تو بیان ہو چکا تھا اور حضور ﷺ اس پر عمل کر چکے تھے۔ مالِ غنیمت کے بارے میں حکم یہ تھا کہ سارا مال جمع ہوگا' اس کا پانچواں حصہ بیت المال کا ہوگا اور بقیہ سارا مال مجاہدین میں مساوی تقسیم کیا جائے گا۔ اور اس تقسیم میں بھی فرق یہ ہوگا کہ پیدل کے لئے اکہرا اور سوار کے لئے دوہرا حصہ ہوگا' چاہے کوئی پہرے پر ہی کھڑا رہا ہو اور اس نے تلوار اٹھائی ہی نہ ہو۔ بلکہ حضور ﷺ نے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بھی حصہ لگایا اگرچہ وہ وہاں شریک بھی نہیں تھے' کیونکہ وہ حضور ﷺ کے حکم سے مدینہ منورہ میں رہ گئے تھے۔ لہٰذا اُن کو بھی اس غزوہ میں شریک فرض کیا گیا۔

تو جب یہ قانون آ چکا تھا تو کسی کو کیا ضرورت تھی کہ وہاں جاتا کہ مال جمع کرے۔ اس حماقت کو ذہن سے نکال دیجئے۔ اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بڑا سوءِ ظن پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ یہ تو ابھی سن ۳ ہجری کا واقعہ ہے اور اس میں تمام سابقون الاوّلون شریک ہیں۔ اس میں تو منافقین شریک بھی نہیں ہوئے تھے' بلکہ عبد اللہ بن اُبی کے ساتھ میدان چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ یہ سن ۱۰ یا ۱۱ کی بات ہوتی تو کسی قدر قابل التفات ہوتی کہ اب تو بہت کچے پکے لوگ بھی مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے۔ جبکہ یہ تو خالص لوگ تھے۔ ان سے یہ سوءِ ظن بہت بڑی غلطی ہے جن لوگوں کے ذریعے سے بھی پھیلی ہے۔ اصل بات کیا تھی؟ سورۃ الصّف کی آیت ۱۳ سے یہ بات کھل رہی ہے' جہاں فرمایا: ﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۞﴾ ''ایک اور چیز جو تمہیں پسند ہے' (یعنی) اللہ کی طرف سے مدد اور فتح جو قریب ہے''۔ یہ فتح کی طلب اور فتح کی قدر و قیمت ہے جس سے تم ڈھیلے پڑتے ہو۔ حالانکہ ع

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر!

اصل کامیابی تو یہ ہے کہ تم بس اللہ کی راہ میں اپنا تن من دھن لگا دو۔ جہاں تمہارے اندر

جلد سے جلد فتح حاصل کرنے کی طلب پیدا ہو جائے گی' یا تم عجلت پسندی کا شکار ہو جاؤ گے' یا کوئی راہ یسیر (شارٹ کٹ) تلاش کرو گے' ٹیڑھی انگلیوں سے مکھن نکالنے کی کوشش کرو گے تو نتیجتاً اصل منزل سے ہٹ جاؤ گے۔ یہ ساری حماقتیں صرف اس لئے ہوتی ہیں کہ دُنیوی فتح محبوب ہے۔ دنیاوی سطح پر کامیاب ہو جانا' اس کی نگاہ کے اندر اہمیت پیدا ہوگئی ہے اور یہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ غزوۂ اُحد میں بھی غلطی اسی بنیاد پر ہوئی۔ یہ بات بالکل نفسیاتی اعتبار سے ہے۔ جب آپ طے کرتے ہیں کہ آپ کو ۱۰۰ میل جانا ہے تو آپ شاید ۸۰ یا ۹۰ میل پر جا کر کچھ ڈھیلے پڑیں کہ اب تو منزل قریب آ گئی ہے۔ اور اگر آپ نے اپنی منزل ہی ۲۰ میل پر متعین کر لی ہے تو یہی کیفیت ۱۷' ۱۸ میل پر پیدا ہو جائے گی۔ کسی شخص کی اپنے کام کے لئے جتنی adjustment ہوتی ہے اس کے اندر اتنے ہی عرصہ کے لئے چاک و چوبند ہونے اور آمادۂ عمل رہنے کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ اور منزل پر پہنچ کر تو آدمی ڈھیلا پڑتا ہی ہے۔ اس کے بعد تو اعصاب ڈھیلے پڑتے ہیں' آدمی کپڑے اتارتا ہے اور relax ہو جاتا ہے کہ اب پہنچ گئے۔ تو یہی فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے اس relaxation کے تحت نظم کو ڈھیلا کیا ہے۔ جس انداز سے میں نے یہ آیت سمجھائی ہے اس طرح حقیقت کے اعتبار سے ہمیں جو سبق لینا ہے وہ ہمیں پورا مل جائے گا اور صحابہ کرامؓ کے بارے میں سوءِ ظن بھی نہیں رہے گا۔

اسی آیت میں آگے فرمایا جا رہا ہے: ﴿مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ﴾ ''تم میں سے کچھ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور کچھ آخرت چاہتے تھے''۔ اب اس کی تاویل بھی ہم اسی طور سے کریں گے کہ تم میں وہ بھی ہیں جو دنیا میں فتح کے طالب ہیں اور وہ بھی ہیں جو صرف آخرت کے طالب ہیں۔ جبکہ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ جیسے سورۃ التغابن میں آیا: ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ ''وہ ہوگا اصل ہار اور جیت کے فیصلے کا دن''۔ ہار اور جیت کا فیصلہ تو وہاں ہوگا' یہاں کی ہار ہار نہیں' یہاں کی جیت جیت نہیں۔ کتنے ہیں جو جیت کر ہارتے ہیں اور کتنے ہیں جو ہار کر

جیتے ہیں۔ ﴿یَوْمَ یَجْمَعُکُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ یہ الفاظ اپنے دل پر نقش کر لیجئے۔ یہاں کی فتح کا تصور ہی نہ رکھو۔ اس دنیا کی کامیابی کی کوئی غرض ہی نہ رکھو! بلکہ احساسِ فرض کے تحت حرکت کرو۔ دنیا میں کامیابی کا کتنے فیصد امکان ہے اور کتنے فیصد نہیں ہے' یہ حساب کتاب اس راستے پر نہیں چلے گا۔ صد فیصد ناکامی کا یقین ہو پھر بھی انسان اس راہ پر چلے گا اگر اس کا مطلوب صرف آخرت ہو۔ یہی بات تھی کہ جنگ موتہ کے موقع پر صرف تین ہزار کا لشکر ایک لاکھ سے ٹکرا گیا تھا۔ اور وہ کسی ایک شخص کا فیصلہ بھی نہیں تھا' بلکہ اس ضمن میں باقاعدہ مشورہ ہوا ہے' باقاعدہ تقریریں ہوئی ہیں۔ یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ یہ معاملہ درست نہیں ہے' کیونکہ نسبت تناسب میں بہت زیادہ فرق ہے' ایک اور تینتیس کی نسبت ہے۔ لیکن کچھ لوگوں نے کہا' اور ان کی رائے مانی گئی' کہ ہمارا مطلوب و مقصود فتح کب ہے؟ ہمارا مطلوب و مقصود تو شہادت ہے!

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

لہٰذا وہاں افہام و تفہیم سے بات طے ہوئی' کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اور اس پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کوئی سرزنش نہیں کی گئی' بلکہ مسلمانوں نے اس بات پر سرزنش کی کہ یہ لوٹ کر کیوں آئے؟ لوگوں نے ہاتھوں میں ریت اٹھا کر لوٹنے والوں کے چہروں پر پھینکی۔ حضور ﷺ نے اُن کا دفاع کیا اور فرمایا کہ انہوں نے میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار نہیں کی' بلکہ ان کا معاملہ ''مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ'' والا ہے' یعنی اپنی اصل قوت کی طرف رجوع کرنے کا معاملہ ہے' تاکہ پھر سے طاقت لے کر آئیں اور حملہ کریں' یہ فرار نہیں ہے۔

بہرحال اس فرق کو ذہن میں رکھئے! اسی لئے ہم اتنی وضاحت سے بحث کرتے ہیں کہ ہمارا نصب العین صرف اور صرف اللہ کی رضا اور اُخروی فلاح ہے۔ نصب العین انقلاب یا اقامت دین اور دین کا غلبہ نہیں ہے۔ جہاں یہ چیزیں نصب العین کے درجہ

میں آئیں گی وہاں حماقتیں لازماً ہوں گی' غلطیاں لامحالہ ہوں گی۔

آگے ارشاد ہوا: ﴿ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ ﴾ ''پھر اللہ نے تمہیں پھیر دیا ان سے' تاکہ تمہیں آزمائے''۔ دیکھئے عجیب انداز ہے کہ ''تمہیں پھیر دیتا ہے ان سے''۔ مطلب یہ کہ تم دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ اب ہوا یہ کہ تم جس کی قوت سے یہ سب کچھ کر رہے تھے اب اس قوت نے گویا تمہارا رُخ پھیر دیا۔ کفار نے تمہارا رُخ نہیں پھیرا' یہ رُخ اس نے پھیرا ہے' تاکہ تمہیں جانچے' پرکھے' تمہیں ابتلاء میں ڈالے' تاکہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو اور تم آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر سکو۔ تمہاری اس غلطی سے درگزر بھی کیا جا سکتا تھا کہ تمہیں اس وقت کوئی سزا نہ دی جاتی۔ لیکن پھر یہ غلطی تمہارے اندر راسخ ہو جاتی۔ پھر تمہارا ڈھیلا پن مستقل ہو جاتا۔ تمہیں سبق سکھانا مقصود تھا' تمہاری تربیت پیشِ نظر تھی' تمہاری اصلاح مقصود تھی۔ سرزنش اس لئے ضروری تھی تاکہ ایک دفعہ بات واضح ہو جائے کہ نظم کسے کہتے ہیں' ڈسپلن کے کیا معنی ہیں' اطاعت امر کی کیا حیثیت اور کیا اہمیت ہے۔ یہاں'' لِيَبْتَلِيَكُمْ '' کا لفظ آیا ہے کہ اللہ تمہاری آزمائش کرے۔ بَلَا' يَبْلُوْ آزمائش کے لئے آتا ہے۔ اسی سے ابتلاء بنا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۚ ﴾ ''اللہ نے موت اور حیات کو پیدا فرمایا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون حسن عمل کا مظاہرہ کرنے والا ہے''۔

اہل ایمان کی تسلی کے لئے آگے فرما دیا: ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ﴾ ''واقعی وہ تمہیں معاف فرما چکا''۔ اب تمہارے لئے آخرت کی کوئی سزا نہیں ہے' جو بھی سرزنش تھی یہاں ہو گئی۔ ﴿ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۞ ﴾ ''اور اللہ اہل ایمان پر بہت بڑے فضل والا ہے''۔

''اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ '' کا مفہوم

سورۂ آل عمران' آیت ۱۵۴ میں الفاظ ہیں: ﴿يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ ''یہ کہتے ہیں کہ ہمارا بھی امر میں کوئی حصہ ہے یا نہیں؟'' یعنی ہماری بھی کوئی

بات مانی جائے گی یا نہیں؟ کوئی ہماری بھی رائے چلے گی یا نہیں؟ یہ انسان کی طبعی و فطری کمزوری ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ میں بھی اختیار ہو' میری رائے کو بھی اہمیت دی جائے۔ یہی وہ Sense of participation ہے جسے ملحوظ رکھنا حکومت اور ریاست کی سطح پر بہت ضروری ہے کہ ہمارا معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے' ہم اس میں participate کر رہے ہیں' ہماری رائے سے فیصلے ہوتے ہیں۔ لیکن جماعتی سطح پر' اُس نظم میں جو بیعت سمع وطاعت پر قائم ہو' یہی چیز سب سے بڑی مہلک شے بن جاتی ہے۔ چنانچہ ان کی اس بات کا کہ ''اس امر میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے یا نہیں؟'' جو جواب دیا گیا وہ بڑا عجیب ہے: ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾ ''(اے نبی!) ان سے کہہ دیجئے کہ امر تو کُل کا کُل اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ اس جواب پر وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے تو رسول کے حکم سے اختلاف کیا تھا' اللہ کے حکم سے کب کیا تھا؟ یہ تو رسول کا اجتہادی حکم تھا۔

اس کا پس منظر ذہن میں رکھئے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر عبداللہ بن اُبی اور اس کے ۳۰۰ ساتھی کیوں واپس گئے تھے؟ اس لئے کہ اس نے یہ رائے دی تھی کہ مدینہ میں محصور رہ کر دفاع کیا جائے۔ جیسے کہ دو سال بعد غزوۂ احزاب میں ہوا اور اللہ کے فضل وکرم سے بارہ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کیا گیا۔ حضور ﷺ کی اپنی رائے بھی یہی تھی' لیکن حضورؐ نے صحابہ کرام ؓ کے جوشِ ایمان اور ذوقِ شہادت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی رائے کا احترام کیا اور مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ اب دیکھئے۔ اوّلاً یہ اللہ کا حکم نہیں تھا' ثانیاً رسول اللہ ﷺ کی بھی یہ رائے نہیں تھی۔ ہاں' رسولؐ نے جو فیصلہ کر دیا یہ اس کی مخالفت ہے۔ اگرچہ رسولؐ نے اپنی رائے کو پس پشت رکھ کر اپنے ساتھیوں کی رائے کے مطابق فیصلہ کیا' لیکن اب اس سے اختلاف رسول اللہ ﷺ کے فیصلے سے اختلاف ہے۔ چنانچہ اس کو واضح کر دیا گیا کہ چاہے یہ اتنا سا معاملہ ہے' لیکن حقیقت میں یہ اللہ کی معصیت ہے' یہ اللہ کے اختیار کو چیلنج کرنا ہے۔ ایک سپاہی جب یونیفارم میں ہے تو وہ حکومت کا نمائندہ ہے' اس کی توہین حکومت کی توہین ہے اور اس کی

اطاعت حکومت کی اطاعت ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک حکومتی نظم کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اگر وہ وردی میں نہیں تو عام انسان ہے' اس کے ساتھ آپ کا جھگڑا ذاتی سطح پر شمار ہوگا' لیکن اگر وہ وردی اور پیٹی میں ہے تو اسے چیلنج کرنا حکومت کو چیلنج کرنا ہے۔ لہٰذا یہ نظم کا معاملہ ہے۔ اور جب یہ اس سطح پر آئے گا تو بات اللہ تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ امر کُل کا کُل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ حالانکہ ہم ابھی سورۃ النساء کی آیت میں ''اُولِی الْاَمْرِ'' کے الفاظ پڑھ کر آئے ہیں' یعنی تم میں سے جو اصحابِ امر ہیں۔ بظاہر تو یہاں تضاد معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فرما دیا: ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾ کہہ دیجئے کہ امر کُل کا کُل اللہ کے لئے ہے! تو اس تضاد کو جو بظاہر پیدا ہو رہا ہے' رفع کر لیجئے۔ درحقیقت اس chain کے ساتھ اگر کوئی امر آ رہا ہے تو وہ حقیقتاً اللہ کا ہے' وہ علیحدہ نہیں رہا۔ اللہ کا رسول حکم دے رہا ہے تو اللہ کا حکم ہے۔ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کے نیچے جو نظم جماعت بنا ہے اس کا حکم بھی اللہ کا حکم ہے ع

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ!

آیۂ استخلاف کے مضامین کا اجمالی جائزہ

آج کے درس کے ضمن میں آخری مقام سورۃ النور کی تین آیات (۵۴ تا ۵۶) پر مشتمل ہے۔ اس میں سے اکثر حصے کا مفہوم تو ہمارے سامنے آ چکا ہے' صرف ایک نکتہ ہے جس کی وضاحت درکار ہے' باقی ہم صرف ترجمہ کریں گے۔ فرمایا: ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ﴾ ''کہہ دیجئے (اے نبیؐ!) اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی''۔ اب یہاں ہر جگہ پر مقدر (understood) مانئے: ﴿وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾ ''اور اپنے میں سے اصحاب امر کی''۔ آگے فرمایا: ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ﴾ ''پھر اگر وہ روگردانی کریں (پیٹھ موڑ لیں) تو جان لو کہ رسولؐ پر ذمہ داری ہے اس کی جس کا بوجھ اس پر ڈالا گیا ہے اور تم پر ذمہ داری ہے اس کی جس کا بوجھ تم پر ڈالا گیا''۔ صاحب امر بھی اللہ کے ہاں مسئول ہے اور تم بھی اللہ کے ہاں مسئول ہو۔ رسول کے ذمہ ابلاغ اور تبلیغ کا حق ادا کر دینا ہے اور تمہارے

ذمہ اسے قبول کرنا ہے۔ اگر بالفرض ابلاغ میں کمی رہی تو رسول پکڑے جائیں گے اور اگر انہوں نے اپنا کام پورا کر دیا تو رسول بری ہو جائیں گے اور اب ساری پُرسش تمہاری ہوگی۔ اسی طرح امراء کے ذمے جو بھی فرائض اور ذمہ داریاں ہیں وہ ان کے مسئول ہیں' انہوں نے جلد بازی میں فیصلہ کر لیا تو اپنی جواب دہی اللہ کے یہاں کریں گے' انہوں نے تمہارے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جو کرنا چاہئے تھا تو وہ اس کے لئے اللہ کے حضور جواب دہ ہوں گے' لیکن اگر مامورین نے اپنے فرائض ادا نہ کئے تو ان کی پُرسش ہوگی۔ دنیا میں کوئی چیز یک طرفہ تو ہوتی نہیں۔ اگر مامورین کے کچھ فرائض ہیں تو امراء کے بھی فرائض ہیں اور امراء کے حقوق ہیں تو مامورین کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ لیکن ہمارا تصور یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی پر توجہ کو مرتکز کرے' اپنے حقوق کی طلب پر توجہ کا ارتکاز نہ کرے۔ اگر کوئی حق مارا گیا تو دنیاوی اعتبار سے تو نقصان ہے' مگر اُخروی اعتبار سے نفع ہے۔ ذمہ داری تو اس پر ہے جس نے آپ کا حق مارا ہے۔ آخرت میں جا کر لین دین ہو جائے گا' حساب کتاب ہو جائے گا۔ وہاں تم کچھ حاصل ہی کرو گے' ہاتھ سے کچھ دینا نہ پڑے گا۔ اگر اصل یوم التغابن آخرت ہے تو تمہارے لئے یہ نفع کا سودا ہے' نقصان کا تو نہیں۔

یہاں سورۃ الاعراف کی یہ آیت بھی پیش نظر رکھئے جو تصورِ شہادت علی الناس کے ضمن میں بہت اہم ہے: ﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾ (آیت ۶) ''ہم پوچھ کر رہیں گے ان سے بھی جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا تھا اور پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی''۔ رسول بھی تو مسئول ہے' وہ بھی بندہ ہے (وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ) پھر ان کے نیچے جو بھی نظم جماعت کے صاحب امر ہوں گے وہ بھی غیر معصوم انسان ہیں' ان سے بھی خطا اور نسیان کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سمجھنے کی اصل بات یہ ہے کہ تم اپنی ذمہ داری کو دیکھو کہ کیا ہے' اس میں تو کوئی کمی نہیں کر رہے؟ اس کی جواب دہی تمہیں کرنی پڑے گی۔

﴿وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا﴾ ''اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے''۔

﴿وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ ''اور رسول کے ذمہ نہیں ہے مگر صاف صاف پہنچا دینا''۔

آگے فرمایا: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''اللہ نے وعدہ کیا ہے تم سے' یعنی ان سے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے''۔ میں نے ''یعنی'' کے ساتھ ترجمہ اس لئے کیا ہے کہ یہاں ''مِنْ'' تبعیضیہ نہیں ہے' بلکہ ''مِنْ'' بیانیہ ہے۔ اس وعدہ کے اوّلین مخاطب صحابہ کرامؓ ہیں اور ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے کہ بعض کے ساتھ یہ وعدہ ہو اور بعض کے ساتھ نہ ہو' بلکہ مِنْ بیانیہ ہے کہ تم سے یعنی ان سے جو ایمان لائے ہوں اور انہوں نے نیک عمل کئے ہوں۔ البتہ ان کے بعد سب کے لئے یہ مِنْ تبعیضیہ ہے۔ یہ نہیں کہ جو بھی جماعت قائم ہو جائے اور جو لوگ بھی اس کام کے لئے کمر کس لیں ان سے یہ وعدہ ہے۔ بلکہ ان کے ساتھ اللہ کا وعدہ ایمان اور عمل صالح کے تقاضوں کے ساتھ مشروط ہو گا۔ حتمی اور قطعی وعدہ اور بشارت صرف صحابہ کرامؓ کے لئے تھی۔ بعد کا معاملہ مشروط رہے گا۔ جو جس درجہ میں ان تقاضوں کو پورا کرے گا اسی درجہ میں وہ اس وعدہ کا مصداق بننے کی امید رکھ سکتا ہے۔ اور پھر بھی ہو سکتا ہے کہ ایک جماعت اپنے تئیں یہ سمجھ رہی ہو کہ وہ ایمان اور عمل صالح کے تقاضے پورے کر رہی ہے' لیکن ابھی اس کا اقتدار اللہ کی حکمت اور مصلحت میں نہ ہو۔ ابھی کوئی کمی ہے جسے اللہ جانتا ہے۔ تم تو اپنے آپ کو کامل سمجھ رہے ہو مگر اللہ جانتا ہے کہ تم کتنے کچھ کامل ہو اور کتنے کچھ نہیں ہو۔ ﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى﴾ ''اپنے آپ کو نفس مزکّی نہ سمجھا کرو' وہ جانتا ہے اس کو جو واقعی متقی ہے''۔ بہر حال اللہ کا یہ وعدہ ان لوگوں سے ہے جو ایمان اور عمل صالح کے تقاضے پورے کر دیں گے۔ یہاں اپنے ذہن میں سورۃ العصر کے مضامین تازہ کیجئے اور پھر پورا منتخب نصاب ذہن میں لے آیئے۔ عمل صالح سے مراد صرف نماز' روزہ اور نوافل نہیں' بلکہ عمل کا پورا ایک جامع تصور ہے۔ ایمان بھی صرف زبانی اقرار کا نام نہیں' بلکہ اس کے عملی تقاضے پورے کرنا بھی ضروری ہے۔

اللہ نے ان سے کیا وعدہ کیا ہے: ﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ﴾ ''وہ لازماً انہیں زمین میں خلافت عطا فرمائے گا جیسے کہ اس نے ان سے پہلوں کو خلافت عطا فرمائی تھی''۔ یہ آیت مبارکہ خاص طور پر یہاں شامل کی گئی ہے' ورنہ پہلی آیت پر ہمارا یہ درس مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ بہت اہم آیت ہے اور یہ خلافت راشدہ کی حقانیت پر اہل تشیع کے خلاف برہانِ قاطع ہے۔ اللہ کا یہ وعدہ جن حضرات سے پورا ہوا کیا وہ ایمان اور عمل صالح کے اعلیٰ ترین معیار پر نہیں ہوں گے؟ یا پھر (معاذ اللہ) اللہ کا وعدہ جھوٹا ہے اور اللہ منافقوں کے ساتھ یہ وعدہ کر رہا ہے؟ یہ خلافت بالفعل قائم ہوئی یا نہیں ہوئی؟ یہ تو تاریخی واقعہ ہے' اس میں تو کسی کو اختلاف نہیں ہوگا۔ تو کن سے یہ وعدہ کیا گیا تھا؟ ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ یہ آیت ان کے غلط فلسفے اور گمراہ کن نظریات کے پورے تانے بانے کو ادھیڑ کر رکھ دینے والی ہے۔

اس وعدۂ استخلاف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ﴾ ''اور وہ لازماً تمکن عطا فرمائے گا (زمین میں جمادے گا) ان کے اس دین کو جو اللہ نے ان کے لئے پسند فرما لیا ہے''۔ یہ الفاظ مبارکہ خلافت راشدہ کے لئے بھی سند ہیں اور خلفاء راشدین کے لئے بھی۔ ﴿وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ﴾ ''اور لازماً بدل دے گا خوف کی اس کیفیت کے بعد اس کو امن کی ایک حالت سے''۔ ان الفاظ میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ جن حضرات کی رائے میں حضرت علی ﷺ کا عہد خلافت' خلافت راشدہ میں شامل نہیں ہے' ان کے موقف کے لئے بھی دلیل موجود ہے۔ اس لئے کہ اس پورے عرصے میں امن نہیں تھا' یہ جنگ و جدال کا دَور تھا' تلواریں ایک دوسرے کے خلاف چلتی رہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ بہت منطقی انسان تھے۔ انہوں نے دو باتوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا کہ ایک شخص کا اپنی ذات میں خلیفۂ راشد ہونا اور ہے' جبکہ اس کے عہد خلافت کا خلافت راشدہ میں شامل ہونا اور ہے۔ چنانچہ حضرت علی ﷺ اپنی ذات میں خلیفۂ راشد ہیں' خلافتِ راشدہ کے تمام

معیارات ان کی ذات کی حد تک پورے ہیں' لیکن ان کا عہد حکومت اس معیار پر پورا نہیں اتر رہا۔ ایک تو اس عرصے میں افتراق رہا اور اس دَور میں عالم اسلام ایک وحدت نہیں رہا۔ دوسرے یہاں امن کی کیفیت نہیں تھی۔

آگے فرمایا: ﴿یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ؕ﴾ ''وہ میری ہی بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کریں گے''۔ یہ بہت بڑی بڑی بشارتیں ہیں اور دورِ خلافت راشدہ کے چوبیس برس اس کا مصداقِ اَتم اور مصداقِ کامل ہیں۔ بعد میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ عمارت یک دم بالکل ہی زمین بوس ہوگئی ہو' بلکہ درجہ بدرجہ نیچے آئے ہیں۔ لیکن ایک آئیڈیل اور ہر اعتبار سے دورِ نبوت کا عکس کامل یہ چوبیس یا ساڑھے چوبیس برس تھے۔ ﴿وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۞﴾ ''اور جو اِس کے بعد بھی کفر کرے گا تو وہی لوگ درحقیقت فاسق ہیں''۔ یہاں ''بَعْدَ ذٰلِکَ'' سے کیا مراد ہے؟ یہ کہ اس وعدے کے بعد بھی! اللہ کا اتنا پختہ وعدہ' اللہ کی طرف سے اتنی موثق توثیق اور پھر بھی کوئی کفر کرے! اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب دین اس طرح غالب ہو چکا ہو اور امن قائم ہو چکا ہو' فتنہ باقی نہ رہے' اس کے بعد بھی اگر کوئی غلط راستے پر چلتا ہے تو وہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس میں خیر کا کوئی عنصر ہے ہی نہیں۔

آخری آیت میں فرمایا: ﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ.....﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''..... ہمارے آج کے درس کے خاتمے کے لئے یہ نہایت جامع اور نہایت موزوں الفاظ آ گئے ہیں۔ یہاں سورۃ الحج کی آخری دو آیات ذہن میں تازہ کیجئے' جن میں ایمان کے منطقی تقاضے بیان کئے گئے ہیں: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞ وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ؕ..... الخ﴾ دین کے عملی تقاضوں کی آخری سیڑھی جہاد فی سبیل اللہ ہے جسے آنحضور ﷺ نے دین کا ''ذروۃ السنام'' قرار دیا ہے' لیکن عمل کے زینے کی پہلی سیڑھی فرائض دینی کی بجا آوری اور ارکانِ اسلام کی پابندی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے فرمایا: ''رکوع کرو اور سجدہ کرو''۔ پہلی سیڑھی پر قدم جماؤ گے تو دوسری

پر چڑھنے کا امکان ہوگا۔ اگر یہیں پر قدم لرز رہے ہیں اور آپ کو استقامت حاصل نہیں تو اگلی کا کیا سوال؟ اسی لئے وہاں آخر میں پھر فرمایا: ﴿فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ؕ ھُوَ مَوْلٰکُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ﴾ ''پس قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور مضبوط پکڑ و اللہ (کی رسی) کو' وہ تمہارا مالک ہے' سو خوب مالک ہے اور خوب مددگار''۔ یعنی اگر یہ سارا تصورِ دین سمجھ آ گیا اور تین منزلیں ذہن میں جم گئیں تو بسم اللہ کرو۔ کہاں سے کرو گے؟ قائم کرو نماز' ادا کرو زکوٰۃ! پہلی سیڑھی تو وہی ہوگی۔ ستون ڈالو گے تو چھت کا امکان ہے۔ پہلی منزل بنے گی تو دوسری کا امکان ہے اور دوسری بنے گی تو تیسری کا امکان ہے۔ لہٰذا وہاں (سورۃ الحج میں) جو ترتیب تھی وہی یہاں (سورۃ النور میں) ہے: ﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ ''قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور اطاعت کرو رسولؐ کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔ واضح رہے کہ یہاں رسولؐ کی اطاعت صرف رسول کی حیثیت میں مراد نہیں ہے' بلکہ امیر کی حیثیت میں بھی' سپہ سالار کی حیثیت میں بھی' چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے بھی اور چیف جسٹس کی حیثیت سے بھی مراد ہے۔ چنانچہ آیت مبارکہ کے آخری الفاظ بہت معنی خیز ہیں: ﴿وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ ''اور رسولؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے!''

اللھم ربنا اجعلنا منھم' اللھم اغفرلنا وارحمنا واھدنا وعافنا وارزقنا' انت ولینا فی الدنیا والآخرۃ' توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین برحمتك یا ارحم الراحمین OO

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات واحادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ایک اہم نصیحت نامہ

از مدیر ماہنامہ ''بیداری'' جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو

اور اس کا جواب

از بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

محترم نبی احمد لودھی صاحب بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعتِ اسلامی کے دور کے دوست اور رفیق کار تھے۔ بعد میں ع ''او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم!'' کے مصداق ان دونوں کے راستے جدا ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے جماعتِ اسلامی سے علیحدگی کے کچھ عرصہ بعد مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی بنا ڈالی' اور اس کے تین سال بعد تنظیم اسلامی قائم کی ـــــ جبکہ لودھی صاحب تصوف کی طرف مائل ہوئے اور سلسلۂ چشتیہ کے ایک بزرگ سے بیعت ہو گئے ـــــ اور طویل عرصہ تک دونوں حضرات کے مابین کوئی رابطہ نہ رہا ـــــ کچھ عرصہ قبل اچانک لودھی صاحب کے بعض مفصل و مطول خطوط موصول ہوئے جن میں انہوں نے بانی تنظیم اسلامی کے بعض افکار و آراء پر شدید تنقید کی تھی لیکن تحریر ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرنے کی بجائے ایک کتاب کے مسودہ کی صورت میں تھی جس میں ڈاکٹر صاحب کا ذکر بصیغہ غائب تھا ـــــ لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے اس کا چنداں نوٹس نہیں لیا۔ بہر حال اس سال کے اوائل میں وہ پورا مواد: ''عہد حاضر میں تلبیس ابلیس ـــــ جدید فکر اسلامی ـــــ ایک تحقیقی اور تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے طبع ہو کر کتابی صورت میں آ گیا ـــــ ڈاکٹر صاحب نے تو پھر بھی اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا' لیکن لودھی صاحب نے اس کا ایک نسخہ حافظ محمد موسیٰ بھٹو' مدیر ''بیداری'' حیدر آباد سندھ کو بھی بھیج دیا۔ جس پر ایک نصیحت نامہ تو بھٹو صاحب نے لودھی صاحب کے نام شائع کر دیا' جس کے چند حوالے حسب ذیل ہیں:

''محترم جناب گرامی قدر نبی احمد لودھی صاحب
السلام علیکم' مزاج شریف
آپ کی ارسال کردہ ''جدید فکر اسلامی۔ ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' ملی۔ میں نے کتاب پر ایک نظر ڈالی ہے۔ آپ نے محنت تو بہت زیادہ کی ہے' لیکن جس مقصد کے لئے کتاب لکھی گئی ہے' وہ مقصد حاصل ہونا مشکل ہے۔ جدید اسلامی فکر نے جن افراد کو متاثر کیا ہے وہ وہ افراد ہیں جو جدیدیت کے حامل تھے' جن کا تصوف کے ذریعہ ذکر وفکر اور محبت ومعرفت کی طرف آنا مشکل تھا۔ جماعت اسلامی' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب یا علامہ جاوید احمد غامدی صاحب نے اس طرح کے افراد کو اسلامی پلیٹ فارم مہیا کر کے دینی خدمت سرانجام دی ہے' جس کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہے..... آپ نے براہ راست اسلامی فکر کے علمبرداروں پر تفصیلی تنقید کر کے ایک تو اپنی صلاحیتوں کے صحیح استعمال میں کوتاہی فرمائی ہے۔ دوم یہ کہ اس سے تصوف واہل تصوف کا رواداری کا پہلو بھی مجروح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تصوف واہل تصوف کا پیام' محبت کا پیام ہے۔ اللہ کے ساتھ محبت' اللہ کے بندوں کے ساتھ محبت اور دوسروں کی زیادتیوں کے باوجود انہیں معاف کرنے اور ان کے لئے دعائے خیر کرتے رہنے کا پیام ہے..... راقم چونکہ جدید اسلامی فکر سے قریب رہا ہے' اس لئے اس کی نظر میں اس طرح کی کتاب کی افادیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ آپ اس موضوع پر مزید لکھنا چاہ رہے ہیں' راقم کے خیال میں آپ کی صلاحیتوں کا اس سے بہتر مصرف ہوسکتا ہے۔ تنقیدی کام میں وقت' صلاحیتوں اور توانائیوں کا استعمال جہاں امت کو مزید کمزور کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے' وہاں جس حلقہ سے وابستہ افراد کے لئے لکھا جارہا ہے' ان میں خود احتسابی کے بجائے' مزید ضد کی کیفیت پیدا ہونے کا امکان غالب ہے.....
امید ہے کہ راقم کی معروضات پر غور وفکر فرمائیں گے۔ والسلام
احقر محمد موسیٰ بھٹو''

اور اس کے ساتھ ساتھ اگلی ہی اشاعت میں ایک مفصل نصیحت نامہ بانی تنظیم اسلامی کے نام بھی شائع کر دیا۔۔۔۔ جس کا اسی قدر تفصیلی جواب ڈاکٹر صاحب نے تحریر کیا اور اسے بھی بھٹو صاحب نے ''بیداری'' میں شائع کر دیا۔

ادارۂ ''میثاق'' نے اس خط وکتابت کی جانب توجہ نہیں کی تھی کہ اچانک ''کروسیڈ؟'' کے عنوان سے ایک کتاب موجودہ عالمی حالات اور بالخصوص صیہونیت اور امریکہ کا گٹھ جوڑ اُمتِ مسلمہ کے خلاف جو سازشی اقدامات کر رہا

ہے کے موضوع پر موصول ہوئی ـــــ اس کے مؤلف جناب غلام محمد خیر البشر صاحب نے اس کے ساتھ ایک خط بھی بانیٔ تنظیم اسلامی کے نام ارسال کیا جس میں تحریر فرمایا:

''ماہنامہ 'بیداری' سندھ میں حافظ بھٹو صاحب سے خطاب دراصل پوری امت کے لئے ایک جامع پیغامِ دعوت محسوس ہوا۔ جزاک اللہ تعالیٰ۔ اس نوعیت کی بحث و تمحیص سے مؤمنانہ فراست کے حاملین پر وہ مخفی عقدے کھلتے ہیں جو عام حالات میں ناپید ہوتے ہیں۔

ناچیز آپ کے ''ڈپریشن'' کے حوالے سے آج سے آپ کی بیعت کرتا ہے' جو سلسلہ آپ نے گزشتہ دو عشروں سے اختیار کر رکھا ہے' مجھے اس سے مکمل اتفاق ہے اور میں خالصتاً للہ آپ کو عصر حاضر کا ''مجدد'' اور ''اہلکار'' تسلیم کر کے ''اپنی استطاعت'' کے مطابق اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرنے کا اعلان کرتا ہوں.....!!! اور یہ چیز کم از کم ایک عشرے کے تذبذب اور تحقیق کے مشاہدے کے بعد اچانک آج آپ کا مکتوب مذکورہ پڑھ کر وارد ہوئی''۔

اس پر ڈاکٹر صاحب نے انہیں یہ تحریر فرمایا کہ:

''آپ نے میرے بارے میں جن جذبات و نیک خیالات کا اظہار کیا ہے' اگرچہ میں واقعتاً ان کا اہل نہیں ہوں' تاہم آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں ـــ میں اصلاً صرف قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اللہ کے دین حق کا ایک حقیر خادم ہوں' اور بس! تاہم میں نے اپنے ان دونوں کاموں کو اجتماعی شکل دی ہے ـــ چنانچہ قرآن حکیم کا جو فہم اللہ نے عطا فرمایا اس کو عام کرنے کے لئے تقریر و تحریر کے جملہ ذرائع بھی استعمال کئے اور انجمن خدام القرآن اور قرآن اکیڈمیاں بھی بفضلہٖ تعالیٰ قائم کیں۔ اسی طرح دین حق کے غلبے کی جدوجہد کے لئے تنظیم اسلامی بیعت سمع و طاعت فی المعروف کی مسنون اساس پر قائم کی۔ اب میری عمر کا قافلہ تو شامِ زندگی سے گزر کر شب زندگی کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی ہے اور امید واثق بھی کہ وہ ان دونوں اداروں کو صحیح سمت میں گامزن بھی رکھے گا اور اس کے لئے مجھ سے بہتر مردانِ کار عطا کرتا رہے گا..... آمین!!''

چنانچہ ہمیں اس سے ڈاکٹر صاحب کی جوابی اور وضاحتی تحریر کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ بنابریں اب ہم قارئین ''میثاق'' کی خدمت میں حافظ محمد موسیٰ بھٹو کا نصیحت نامہ اور اس پر بانیٔ تنظیم اسلامی کا تبصرہ اور وضاحت پیش کر رہے ہیں۔ (ادارۂ میثاق)

۱۳ر جولائی ۲۰۰۳ء

محترم جناب گرامی قدر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم.....مزاج شریف!

محترم جناب نبی احمد لودھی کی کتاب ''جدید فکرِ اسلامی ایک مطالعہ ایک جائزہ'' پر مصنف کے نام آپ کے ارسال کردہ خط کی نقل مل گئی' یہ عاجز آپ کا از حد ممنون ہے کہ آپ نے استفادہ کے لئے یہ خط ارسال فرمایا۔ خط پڑھ کر یہ عاجز بڑا محظوظ ہوا۔ آپ کی علالت' ڈپریشن کی حالت اور مسلسل بیماری کی وجہ سے اس عاجز کو تو توقع یہ تھی کہ آپ اس طرح کی چیزوں کا نوٹس لینے کی بجائے مخلصانہ جذبہ سے تنقید کرنے والوں کو دعائیں دیں گے اور ان کا شکریہ ادا کریں گے اور اپنے فکر کی مزید غلطیوں کے لئے ان کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے' تاکہ اپنے فکر کے نقائص کا پوری طرح علم ہو سکے۔ نبی احمد لودھی صاحب' صاحب دل شخصیت ہیں۔ آپ سے ان کے تعلقات کی تاریخ بھی طویل ہے۔ انہوں نے جو تنقید فرمائی ہے' اس میں سختی کے باوجود دردِ دل' جذبہ اصلاح اور رجوع الی اللہ کی تڑپ موجود ہے۔ موصوف نے اس عاجز کو بھی جو خط لکھا ہے' اس میں فرمایا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور دیگر جدید مفکرین تعلق باللہ' محبت و معرفت' اللہ کی یاد جو روح اسلام ہے—— ہمارے یہ مفکرین اپنے معتقدین کو اس اصل اور حقیقی کام کی بجائے انقلابی کام اور نظام کی تبدیلی کا نعرہ دے کر ان کے تزکیۂ نفس کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ اس طرح نہ تو افراد کی اصلاح ہو رہی ہے نہ معاشرہ کی۔

اگر نفس کی اصلاح کو بنیاد بنا کر معاشرہ اور ریاست کی اصلاح کے لئے ضرورت کے مطابق زور دیا جاتا تو حلقہ سے وابستہ افراد میں اصلاحِ نفس کی اہمیت اجاگر ہوتی' اور وہ اس کام کو حقیقتاً ایک کام تصور کرتے اور اپنی اصلاح کے کام کو دوسرے سارے کاموں سے زیادہ مقدم سمجھتے' لیکن چونکہ جدید فکر میں نصب العینی اہمیت دوسرے کاموں کو حاصل ہے' اس لئے نبی احمد لودھی صاحب جیسی صاحبانِ دل شخصیتیں جنہیں جدید اسلامی تحریکوں کا براہِ راست مشاہدہ بھی ہے' ان کا اضطراب بڑھ جاتا ہے۔ ان

کی تحریر میں سختی کا اصل پس منظر یہی ہے۔

سلف صالحین نے اسلامی تعلیمات کا جو نصب العینی ہدف مقرر کیا ہے' جس پر اب تک علمائے ربانی کا اجماع ہے' وہ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ہے' عبادت کو ممتاز مفسروں نے ''لِيَعْبُدُوْنِ'' کے معنی میں لیا ہے۔ یعنی اللہ کی بہتر صورت میں عبادت اسی وقت ہو سکتی ہے' جب معرفتِ ربّ پیدا ہو اور معرفتِ ربّ معرفتِ نفس کے بغیر حاصل ہونا ممکن نہیں۔ جب فرد معرفتِ نفس اور معرفتِ رب کی راہ پر گامزن ہو کر ذکر و فکر میں مجاہدہ کرنے لگتا ہے تو اسے نفسِ انسانی کے حیرت انگیز تجربات کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے اور اس کے مکر و فریب اور عیاریوں کے ہزار ہا گوشے سامنے آنے لگتے ہیں۔ اس وقت فرد مولائے روم کے اس نکتہ کا چشم دید گواہ بن جاتا ہے کہ ہر فرد کے نفس کی ہزار ہا خواہشیں ہیں اور ہر خواہش میں اتنی طاقت ہے کہ اس سے سو شیطان پیدا ہو سکتے ہیں۔ جدید دور کے ممتاز ماہرِ نفسیات کارنیگی کا یہ کہنا کہ انسانی نفسیات کی عجب حالت ہے' فرد نفسیاتی طور پر دنیا اور دولت کا اتنا بھوکا ہے کہ ایک موچی کو بھی اگر آدھی دنیا کی دولت حاصل ہو جائے تو وہ دنیا کی آدھی باقی دولت حاصل کرنے کے لئے اہل دنیا سے صف آرا ہو جائے گا۔ ایک دوسرے ماہر نفسیات ایڈلر کا یہ نظریہ کہ انسان کا سب سے طاقتور جذبہ دوسروں پر فوقیت حاصل کرنے کا جذبہ ہے اور فرد کی ساری زندگی اس جذبہ اور مقصد کے تحت ہی صرف ہوتی ہے۔ ان کا یہ نظریہ بے معنی نہیں ہے' اگرچہ ان کے نظریہ میں نقائص بھی موجود ہیں' تاہم انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں ڈوب کر نفسیات کی کمزوریوں کو سمجھنے کے سلسلہ میں یہ نظریہ ہمیں بہت ساری معلومات فراہم کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب فرد چھوٹے پن کے مراحل سے گزرے بغیر بڑا بن جاتا ہے اور قیادت کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو اس کی نفسیات ہزار ہا خرابیوں کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ نفسیات کی اس خرابی کی وجہ سے اس کا ادراک بھی صحیح نہیں رہتا۔ حبِّ جاہ اور قیادت کے مقاصد اس کے نزدیک اتنے غالب رہتے ہیں کہ اس کی ساری کوشش اس

بات کے لئے ہوتی ہے کہ اپنے حریفوں کو غلط ثابت کرنے اور خود کو برسرِحق ثابت کرنے میں ساری توانائیاں صرف کی جائیں اور دوسرے حلقوں کے افراد کو توڑ کر اپنی افرادی قوت میں اضافہ کر دیا جائے' تاکہ حبِّ جاہ کے جذبہ کی تسکین ہو سکے اور یہ سارا کام قرآن وسنت کے حوالوں' عقلی اور نقلی استدلال اور بڑے خطیبانہ انداز سے ہوتا ہے۔

قرآن میں حضور ﷺ کے جو مقاصد بیان فرمائے گئے ہیں' اس میں تلاوتِ قرآن' تزکیہ اور کتاب اور حکمت کی تعلیم شامل ہے۔ حضور ﷺ کے بعد یہ تینوں چاروں کام امت کی مختلف شخصیتوں میں تقسیم ہوئے۔ مفسروں' محدثوں' فقیہوں اور مزکیوں نے تقسیم کار کے تحت حضور ﷺ کی یہ نصب العینی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ جس طرح حکمت کی تعلیم کے لئے سنت وحدیث کے ماہرین سے استفادہ کئے بغیر چارہ نہیں' اسی طرح مربیوں اور مزکیوں کی صحبت کے بغیر تزکیہ ہونا دشوار ہے۔

سلف صالحین کے علوم اور انسانی نفسیات کے بارے میں ان کے تجربات اور نتائجِ فکر پر عدم اعتماد کا جو نتیجہ ظاہر ہوا ہے' وہ یہ ہے کہ دل کے مقابلہ میں عقلیت کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ دل جو معرفت کا خزانہ اور قوتِ عمل کا مرکز ہے اور جو عقل کو جذبات کے دوش پر بہالے جاتا ہے۔ حقیقتِ دل سے ناآشنائی کی وجہ سے بہت ساری چیزوں کے بارے میں ادراک غلط ہو گیا ہے۔ مثلاً یہ سمجھا جا رہا ہے کہ نظریاتی شعور اور صحیح معلومات عمل صالحہ کی قوت کے لئے کافی ہیں۔ چنانچہ ساری توجہ استدلال' معلومات' لٹریچر' تقاریر' خطابت اور اجلاسوں و کانفرنسوں پر ہے' تاکہ نظریاتی شعور پختہ ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ دینی معلومات حاصل ہو جائیں۔ یقیناً نظریاتی شعور اور ذہنی پختگی کی ایک حد تک ضرورت ہے اور بالخصوص دورِ جدید کے تعلیم یافتہ افراد کا اسلام پر نظریاتی اعتماد تو از حد ضروری ہے' اس کے بغیر ان کے لئے جدیدیت کے سیلاب میں بہنے سے بچنا مشکل ہے۔ لیکن نظریاتی شعور اور صحیح دینی معلومات سے نفس اور دل کی قوتوں پر بھی فتحیابی حاصل ہو سکے گی اور زندگی از خود نیکی کی راہ پر گامزن ہو جائے گی' یہ ایسا تصور ہے جو سلف صالحین کی قرآن وسنت کی تشریحات کے منافی ہے۔ یہی نہیں

بلکہ انسانی نفسیات کے سلسلہ میں دورِ جدید میں جو اہم تحقیقات سامنے آئی ہیں' یہ نقطۂ نگاہ اس سے بھی مناسبت اور مطابقت نہیں رکھتا۔

قرآن وحدیث میں اہل کتاب کے علماء کے بارے میں یہ تصریحات موجود ہیں کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کی پوری معرفت حاصل تھی' وہ اپنی اولاد سے بھی زیادہ بہتر طور پر آپ کو پہچانتے تھے۔ اس معرفت' ادراک اور رسالت مآب ﷺ کی آمد کے بارے میں مسلسل انتظار کے باوجود انہوں نے اگر آپ کا انکار کیا تو اس کا بنیادی سبب قومی تفاخر' ذاتی حسد اور انانیت وکبر کے باطنی جذبات تھے' اس سلسلہ میں علامہ ابن جوزی نے اپنی کتاب ''تلبیس ابلیس'' میں دو ایسے واقعات بیان کئے ہیں کہ انسانی نفسیات کی حیرت انگیز کمزوریاں واضح ہوتی ہیں۔ ان واقعات کی اہمیت کے پیش نظر میں یہاں یہ دونوں واقعات پیش کرتا ہوں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ یہودیوں کے مدرسے میں تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا کہ تم میں جو سب سے بڑا عالم ہو' میں اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں' اس پر عبداللہ بن صوریا جو اس وقت ان کا سب سے بڑا عالم تھا' وہ اٹھ کر آ گیا' رسول اللہ ﷺ اسے الگ لے گئے اور اسے اپنے دین کی قسم دلائی کہ اس حق کے عوض کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر انعام کیا اور اسے کھانے کے لئے من وسلویٰ دیا اور بادل کا سایہ کیا' تم صحیح صحیح بتاؤ' کیا واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اللہ کا رسول نہیں ہوں؟ عبداللہ بن صوریا نے کہا کہ اللہ کی قسم' میں اور میری ساری قوم جانتی ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور توریت میں آپ کی جو صفات بیان کی گئی ہیں آپ ان کے عین مطابق ہیں' لیکن اہل یہود حسد کی وجہ سے آپ سے دشمنی کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ابن صوریا! تمہارے لئے میری تصدیق کرنے کی راہ میں کیا چیز حائل ہے؟ اس نے کہا کہ قوم کی مخالفت کا خوف (یعنی قوم میں فضیلت وبرتری کا جو مقام حاصل ہے' اس کے چھن جانے کا خوف)۔

دوسرا واقعہ سلمہ بن سلامہ بن وقش سے روایت ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ بنی عبد

الاشہل کے محلے میں ایک یہودی ہمارا پڑوسی تھا۔ ایک دن وہ یہودی ہمارے پاس آیا' اس وقت ابھی نبی ﷺ مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ وہ مجلس میں کھڑا ہو کر بیان کرنے لگا۔ میں (سلمہ) اس وقت سارے مجمع میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس یہودی نے اپنی تقریر میں قیامت اور جنت و دوزخ کا ذکر کیا۔ چونکہ سارے لوگ بُت پرست تھے' موت کے بعد کی زندگی کے قائل نہ تھے' اس لئے ان کو نصیحت کی خاطر وہ کہنے لگا: اس وقت جہنمی یہ آرزو کرے گا کہ اے کاش' اسے ایک لمحے کے لئے جہنم سے نکال کر آگ کے ایک بڑے تنور میں ہی ڈالا جائے' تاکہ وہ کم از کم ایک لمحہ کے لئے جہنم کی ہولناک آگ سے بچ سکے' یعنی وہ تنور کی آگ میں بند ہونے کی آرزو کرے گا۔ اس پر لوگوں نے اسے کہا کہ تمہارے پاس اس بات کی دلیل کیا ہے کہ ایسا ہوگا؟ اس نے مکہ و یمن کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس علاقہ سے ایک نبی ظاہر ہوگا' جو اس بات کی گواہی دے گا۔ لوگوں نے کہا کہ وہ کب ظاہر ہوگا؟ چونکہ میں لوگوں میں سب سے چھوٹا تھا' اس لئے اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا یہ لڑکا جب اپنی بلوغت کی عمر کو پہنچے گا۔ چنانچہ ابھی کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے' وہ یہودی ہمارے محلّہ میں موجود تھا' ہم لوگ تو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے' لیکن وہ یہودی تکبر و حسد کی وجہ سے مخالفت کرنے لگا۔ ہم نے اسے کہا کہ ارے بد بخت' کیا تم وہی شخص نہیں ہو جس نے ہمیں رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کی اطلاع دی تھی؟ لیکن اس نے کہا کہ وہ دوسرے پیغمبر ہیں۔ (تلبیس ابلیس ص ۹۴۔۹۵)

یہ واقعات کیا ظاہر کرتے ہیں؟ یہی کہ انسانی نفس بہت طاقتور ہے' وہ محض معلومات اور صحیح نظریاتی تصور سے قابو میں نہیں آتا' اس کے لئے تزکیہ اور باطنی بیماریوں کے مکمل شعور اور اضطراب کی حد تک اپنی اصلاح کی فکر کا ہونا ضروری ہے۔ اگر خالی معلومات اور نیکی اور شر کے احساسات اور حق و باطل کے درمیان تمیز ہی شر سے بچنے اور عمل صالحہ کی قوت پیدا ہونے کے لئے کافی ہوتی تو ہر انسان کے اندر نفس لوامہ کی قوت موجود ہے' جو زندگی کے بہت سارے بنیادی معاملات میں اس کے لئے خیر

اور شر اور صحیح اور غلط کی نشاندہی کرتی رہتی ہے۔ مثلاً جھوٹ' خیانت' دھوکہ دہی' گلا' غیبت' زنا' شراب' کاروبار میں بددیانتی' ملاوٹ اور انسان آزاری جیسے بہت سارے گناہ ہیں' جنہیں تقریباً ہر انسان (جس کا ضمیر مکمل طور پر مردہ نہیں ہوا) وہ انہیں گناہ سمجھتا ہے' اسی طرح انسانیت نوازی' اخلاقِ حسنہ' خیر خواہی' برداشت' تحمل' معافی' احسان کرنا' غریب پروری' صحیح گواہی دینا' مظلوم کی مدد کرنا جیسی بہت سی نیکیاں ہیں' جنہیں تقریباً ہر فرد نیکیاں تصور کرتا ہے' لیکن اس ادراک اور ضمیر کی معلومات اور دباؤ کے باوجود عام طور پر مذکورہ برائیوں سے بچنے اور نیکیوں پر عمل کرنے کی قوت پیدا کیوں نہیں ہوتی۔ اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ عمل کی قوت کے لئے علم وادراک کافی نہیں' اس کے لئے تربیت اور تزکیہ کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ صاحبِ دل' صاحب عمل اور صاحبِ کردار شخصیتیں اپنی حرارت' دل کی طاقت اور پاکیزہ عمل کی قوت سے دل میں ایسی روح پھونک دیتی ہیں اور اس میں سوز وساز کی ایسی کیفیات پیدا کر دیتی ہیں کہ افراد کے لئے عملِ صالحہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ قلوب کو مانجھنے' بیدار کرنے اور ان کے اندر نئی روح پیدا کرنے کا عمل ہوتا ہے' جس سے دل منکر کے خلاف نفرت اور معروف کی محبت سے سرشار ہو جاتے ہیں۔

عالی مرتبت ڈاکٹر صاحب! نفس کی خصوصیات کا جو مطالعہ اب تک کیا گیا ہے' اس سے معلوم ہوا ہے کہ یہ سراسر شر ہے اور صبح سے رات گئے تک یہ مسلسل فتنوں' شرارتوں' عیاریوں اور مکاریوں پر اکساتا رہتا ہے۔ اور علم' ذہانت' مطالعہ اور معلومات سے اس کی شر انگیزی اور فتنہ پروری کی صلاحیت میں قابل ذکر حد تک کمی نہیں آتی' بلکہ عام طور پر اس میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ چونکہ نفس مادہ کی پیداوار ہے' اس لئے اس کی ساری کشش مادی چیزوں کے لئے ہے۔ وہ دنیا میں اپنی خداوندی کے علاوہ دوسرے کی خداوندی کو قبول اور برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ نفس کا جہاں بھی بس چلتا ہے' وہاں وہ عملاً ایسا کر گزرتا ہے۔ موجودہ دور میں نفسی قوتوں کے یہ وہ ''کارنامے اور کرشمے'' ہیں جو جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ دنیاوی زندگی سے وابستہ افراد ہوں یا مذہبی

زندگی سے متعلق افراد' اس سلسلہ میں سب کی حالت قابل رحم ہے' سب اپنے عزیزوں' حلقۂ احباب' افرادِ معاشرہ اور جماعت والوں کے لئے اذیت اور ایذا رسانی کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ یہ سب اس لئے ہے کہ نفس کی غیر معمولی خوفناک قوتوں کا ادراک باقی نہ رہا ہے اور اس کی اصلاح کے کام کو مطلوبہ اہمیت حاصل نہ رہی ہے۔

ایک طرف انسانی شخصیت میں نفسی قوتوں کی یہ کارفرمائی جاری ہے تو دوسری طرف انسانی خودی محبوب حقیقی کے ساتھ والہانہ محبت کے ایسے رشتہ میں جڑی ہوئی ہے کہ وہ لازوال حسن کے مناظر کے مشاہدہ کے لئے ہر آن مضطرب ہے۔ ذکر وفکر جس کی تاکید سے قرآن بھرا ہوا ہے' یہ انسانی خودی کی ایسی ناگزیر ضرورت ہے کہ اس کے بغیر انسانی شخصیت کا پورا نظام ہل جاتا ہے' بلکہ صحیح معنیٰ میں ایسی صورت میں نفس کے شر کی قوتیں اس پر غالب آجاتی ہیں۔ اس موضوع پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین (جو آپ کے پسندیدہ اسلامی فلاسفر ہیں) انہوں نے کتنی عمدہ بحث فرمائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''انسان کا وہ عمل جسے خدا کی عبادت کا نام دیا جاتا ہے اور جس کا بڑا عنصر ذکر ہے' انسان کے تجربات میں سب سے زیادہ قیمتی اور اعلیٰ وارفع ہے۔ اس کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی آرزو کو اپنا صحیح اور قدرتی اظہار پانے کا موقعہ دیتا ہے اور اس طریق سے اس کی مکمل اور مستقل تشفی کر کے اپنی شخصیت کے ارتقاء کو نکتۂ کمال پر پہنچانے کا اہتمام کرتا ہے۔ یہ گویا انسانی خودی کا اپنے مبتدأ کی طرف عود اور اپنی منزلِ مقصود کی طرف رجوع ہے۔ دو بچھڑے ہوئے عاشقوں کی ملاقات ہے' جو کروڑ ہا برس کے ارتقائی عمل کی صورت اختیار کرنے والی ایک دوسرے کی طویل جستجو کے بعد ان کو میسر آئی ہے۔ اقبال ہمیں بتاتا ہے کہ عبادت فطری عمل ہے' جو اصل کے اعتبار سے سائنس دانوں کی جستجوئے صداقت کا ہی ایک تتمہ ہے۔

عبادت (ذکر وفکر) کا منبع انسان کی فطرت میں ہے۔ فکر کے ذریعہ سے سائنس

دان شعور حقیقت کے عمل کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ ذکر کے دوران یہ سست رفتاری سے منکشف ہونے والے عالمگیر اصولوں کی جستجو کی قوت کی حیثیت سے اپنا کام ترک کر دیتا ہے اور فکر سے بالاتر ہو کر براہِ راست حقیقت کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے تا کہ اس کے کام میں ارادی طور پر شرکت کر سکے' اس میں کوئی مخفی یا ناقابل فہم بات نہیں' عبادت (ذکر و فکر) حصولِ تجلی کے ایک ذریعہ کے طور پر ایک قدرتی حیاتیاتی عمل ہے' جس سے ہماری شخصیت کا چھوٹا سا جزیرہ اچانک ہی زندگی کی بڑی وحدت میں اپنا مقام دریافت کر لیتا ہے''۔

(حکمت اقبال' ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

گرامی قدر ڈاکٹر صاحب! اس ساری تفصیل میں جانے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی ہے کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کی مظلومیت اور قوت کے عالمی مراکز سے مسلمانوں کی بے دخلی اور جدید دور کے نظریات کے غلبہ اور ان نظریات کے نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش ہونے کی وجہ سے جدید اسلامی مفکروں کی طرف سے اسلام کی جو نصب العینی تشریح ہوئی ہے' اس میں انسانی نفس کی اہمیت' خودی اور خود شعوری یعنی انسان کی اصل شخصیت کے مقتضیات و داعیات کو نظر انداز کر کے اسلام کی یکسر خارجی تشریح ہوئی ہے اور ذہن اس نصب العینی تشریح میں اس طرح الجھ گیا ہے کہ انسانی ہستی کی فطری ضرورت اور خود شعوری کا محبوب کے لئے اضطراب و بے چینی اور عبادت کے ذریعہ اس بے چینی کی تسکین' اور محبوب کے مقاصد کے لئے حقیقی قلبی اضطراب جیسی چیزیں مفقود ہو گئی ہیں۔

علمائے ربّانی کے سلسلوں سے رابطہ اور قرآن و سنّت کے سلف صالحین کے فہم سے تعلق کے نتیجہ میں جو چیز حاصل ہوتی ہے' وہ یہی ہے کہ انسانی فطرت میں موجود نصب العینی جذبات کو صحیح رخ مل جاتا ہے' احیائے اسلام کے لئے حقیقی تڑپ پیدا ہوتی ہے' نفس اور نفس کی داخلی و خارجی قوتوں کے خلاف جہاد کے لئے صف آرائی کی راہ سجھائی دیتی ہے' اور قیل و قال اور نظریاتی بحثوں میں وقت کے ضیاع سے بچاؤ کی صورت پیدا

ہوتی ہے۔ برصغیر ہند میں ماضی قریب میں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک اور مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی تحریک نے احیائے اسلام کے لئے جو کردار سرانجام دیا ہے' اس سے ہم سب واقف ہیں' ان کا یہ مثالی کردار کس چیز کا مرہون منت تھا؟ وہ سب محبت خداوندی ہی کا نتیجہ تھا' جو تصوف واحسان کے ذریعہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کی اپنی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی یہ ساری جدوجہد تصوف واحسان ہی کا ثمرہ ہے۔ موجودہ دور میں جدید اسلامی فکر کے علمبرداروں کی طرف سے تصوف واحسان سے دوری کا ایک بڑا نتیجہ جو ظاہر ہوا ہے وہ یہی ہے کہ احیائے اسلام اور غلبہ اسلام کے لئے فکرمندی' منصوبہ بندی' استدلال اور قیل وقال کی حد تک اس کی تیاری تو موجود ہے' لیکن اس کے لئے عملی قوت' حقیقی توانائی' کردار کی عزیمت' سیرت کی بلندی' تحمل و بردباری کے اوصاف' عاجزی وخاکساری اور اپنی نفی ذات کے احساسات وغیرہ سے محرومی ہے۔

اگر جدید اسلامی فکر میں تصوف واحسان کے اجزاء کو پوری طرح شامل کیا جائے تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ احیائے اسلام اور فروغِ اسلام کے لئے جدید باصلاحیت افراد کی قوتِ استعداد اور صلاحیت کار میں دسیوں گنا اضافہ ہوسکتا ہے اور نفس پرستی کی داخلی قوتوں کے مضمحل ہونے کی وجہ سے جدید اسلامی تحریکوں وتنظیموں' اداروں اور ان کے افراد کے درمیان باہمی رنجش اور دوری ختم ہو کر محبت کی غیر معمولی فضا بھی پیدا ہوسکتی ہے۔

اپنے دور کے حالات میں دین کو درپیش چیلنج کے مقابلہ کے لئے کام کرنے بالخصوص موجودہ ہنگامہ خیز دور میں اداروں' تحریکوں اور تنظیموں کی سطح پر اسلام کے لئے صف بندی کرنا' یہ وقت کا اہم تقاضا ہے اور دین کی بہت بڑی خدمت ہے اور دین کے فریضوں میں سرفہرست فریضہ ہے' لیکن ظاہر ہے تحفظ دین اور باطل سے مقابلہ کا یہ کام اصلاحِ نفس اور تطہیرِ نفس کی قیمت پر نہیں ہوسکتا۔ جو لوگ نفس پرستی کی دلدل میں مبتلا ہیں' ظاہر ہے ان کے لئے اولیت کا کام تطہیرِ نفس اور اصلاحِ قلب ہی کا کام ہے۔ اس

کے بغیر ان کے لئے دوسرے اور تیسرے مرحلہ کا کام شروع ہی نہیں ہوسکتا۔ جس طرح میڈیکل کے پہلے اور دوسرے سال میں پڑھنے والا شاگرد پرانے اور پیچیدہ امراض کا علاج ہاتھ میں نہیں لے سکتا' اس کا نتیجہ مریضوں کی موت کی صورت میں ہی ظاہر ہوسکتا ہے' یہی حالت یہاں ہے کہ نفسی قوتوں کے مریض افراد کے لئے اقامت دین اور غلبہ دین کا کام کے ہاتھ میں لینے کے بعد حبِّ جاہ' حبّ مال' حسد اور حریصانہ جذبات سے بچنا ان کے لئے دشوار تر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ افراد' نفس پرستی کی دلدل میں مبتلا ہیں اور ان کا علاج ہونا ضروری ہے؟ اس کا طریق یہی ہے کہ روحانی معالجوں نے ۱۳ سو سال سے کروڑہا انسانوں کے باطنی امراض کا علاج کر کے اس سلسلہ میں جو اصول تجویز کئے ہیں' ان اصولوں کو صحیح سمجھا جائے۔ اس سلسلہ میں علمائے ربانی کا اصرار ہے کہ مبتدی (عام فرد) کا نفس شرارت میں شیطان سے زیادہ شریر ہے۔ علمائے ربانی کے اس اصول کو ماننے کے بعد اقامتِ دین' احیائے دین اور غلبہ دین کے کام کا آغاز اصلاح نفس کے کام سے ہونا چاہئے۔ ایسے افراد جوں جوں ابتدائی مراحل سے گزرتے جائیں گے' ان کی سیرت و کردار میں پاکیزگی آتی جائے گی' پھر دوسرے مرحلہ کا کام شروع ہوتا جائے گا۔ اس کام کے لئے بہرحال مربیوں اور مزکیوں کی اہمیت کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔

گرامی قدر ڈاکٹر صاحب! یہ ساری تفصیلات نہ چاہتے ہوئے بھی قلمبند ہوگئیں' یہ آپ سے دلی تعلق کا نتیجہ ہے۔ اس عاجز کی آرزو ہے کہ قرآن کے ذریعہ معاشرہ میں اقامت دین اور غلبہ دین کا کام کرنے والی شخصیت مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کی مخالفت کے ردِّعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھ کر محبت خداوندی کے زیر اثر کام کرے۔ نیز قرآن کو اوڑھنا بچھونا بنانے والی شخصیت اگر شدید ڈپریشن کا شکار ہو جائے (جس کا ذکر میثاق اور حکمت قرآن میں ہوا تھا) تو پھر ایسی شخصیت کے گرد جمع ہونے والے افراد کا ڈپریشن سے بچنا تو مزید مشکل ہو جاتا ہے۔

گرامی قدر ڈاکٹر صاحب! آپ نے ۱۹۸۷ء میں اس عاجز کو اپنے ہاتھ پر بیعت کے لئے فرمایا تھا۔ اس عاجز نے جواباً عرض کیا تھا کہ جو شخصیت خود بیعت ہو کر دوسروں سے بیعتِ جہاد کے مقام تک نہ پہنچی ہو' اس سے بیعت ہونا بجا نہیں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ میں نے ملک بھر میں اپنی طبیعت کے مناسب مرشد کی تلاش کی بہت کوشش کی' لیکن مجھے ایسا مربی نہ مل سکا۔ یہی بات آپ نے محترم جناب نبی احمد لودھی صاحب کے مکتوب گرامی میں لکھنا فرمائی ہے۔ آپ کی طبیعت کی اس بات سے تو مزید ضروری ہو جاتا ہے کہ آپ نفس پر جبر کر کے بھی کسی مربی کی صحبت اختیار فرماتے اور ان سے کسبِ انوار حاصل کرتے۔ اس لئے کہ جب نفس علم و ذہانت کے زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر بڑے سے بڑے مربیوں کو بھی کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ چونکہ کسی کی بڑائی کو تسلیم کرنے سے نفس کو سخت ٹھیس لگتی ہے اور اس کی انا مجروح ہوتی ہے' اس لئے وہ معرفت و روحانیت اور کیفیتِ یقین میں کسی کی بڑائی کو ماننے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں تو نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے اور اس کی باگ کو سختی سے پکڑنا پڑتا ہے' پھر کہیں جا کر وہ باطنی امراض کے لئے کسی بزرگ کے سامنے زانوئے تلمذ کی حیثیت سے آداب بجالانے کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ عام آدمی کی اصلاح زیادہ مشکل نہیں' لیکن جو شخصیت داعی' قائد اور ایک گروہ کے امیر کی حیثیت سے معاشرہ میں کام کرنا چاہتی ہو' اس کے نفس کو تو پھلنے پھولنے اور نفس پرستی کے بہت سارے مواقع مہیا ہوتے ہیں' اس لئے ایسی شخصیت تو ہر وقت نفس کے شدید خطرات میں مبتلا رہتی ہے' اس کی باطنی اصلاح کا مسئلہ تو عام افراد کی اصلاح سے کئی گنا زیادہ اہم اور سنگین ہو جاتا ہے۔

یہ نفسیاتی اصول ہے کہ کسی کی بڑائی اور بزرگی کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرنے سے فرد کی ذہانت' علم' خطابت اور امارت کی بلند سطح از خود درمیانی سطح پر آ جاتی ہے اور نفسیات میں شیخی کی بجائے توازن اور حد اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اہم نفسیاتی نکتہ ہے' تصوف تو دراصل نفسیات میں توازن پیدا کرنے اور معاشرہ کو افراد کی زیادتیوں اور ان کی نفسیاتی خرابیوں سے بچا کر متوازن معاشرہ متشکل دینا چاہتا ہے۔

آپ نے خط میں محترم نبی احمد لودھی صاحب کو یہ بھی لکھا ہے کہ جب مجھے تلاشِ بسیار کے باوجود صحیح مرشد نہ ملا تو میں نے حضرت ہجویریؒ کے اس نکتہ پر عمل کیا کہ جسے صحیح مرشد نہ ملے' اسے چاہئے کہ وہ قرآن کو مرشد بنا لے۔ یقیناً یہ بات بجا ہے۔ قرآن سے بڑھ کر ہدایت' نور اور اصلاح کا ذریعہ اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن سے ہدایت کے لئے بزرگوں نے جو شرائط بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں کہ کافی وقت تک قرآن کو محض اپنی اصلاح اور تہذیب نفس کے لئے پڑھا جائے۔ قرآن سے اکتسابِ فیض کرتے ہوئے نفس کی اس بات کو ہرگز نہ مانا جائے کہ اپنی علمی اور خطابتی صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے قرآن کے علم اور پیغام کو فوری طور پر دوسروں تک پہنچایا جائے۔ چونکہ نفس اور قلب میں انوارِ قرآن پوری طرح جذب ہو کر نفس کو مضمحل کرنے میں ابھی کامیاب نہیں ہوئے ہوتے' اس لئے باطنی امراض کے اعتبار سے مبتدی کے مقام پر فائز شخصیت جب فہمِ قرآن اور دعوتِ قرآن کے اسٹیج پر سامنے آتی ہے یا اس مقصد کے لئے قلم و قرطاس سے کام لیتی ہے تو نفس حبِ جاہ' حبِ مال' انانیت اور بڑے پن کے سارے جذبات سے سرشار ہو کر فرد پر حملہ آور ہونے لگتا ہے' ایسی صورت میں شخصیت کی طرف سے بظاہر تو فہمِ قرآن اور دعوتِ قرآن کا کام ہوتا ہے لیکن بباطن شخصیت کی عالمانہ حیثیت اور اس کی قیادت' سیادت اور بڑائی کے استحکام کا کام ہوتا ہے۔

چونکہ قرآن اصلاحِ نفس کے ساتھ ساتھ علم بھی عطا کرتا ہے' یہ علم اس وقت نافع ہوتا ہے جب شخصیت کے نفس کی تہذیب ہو کر اس کی نفسیات متوازن ہو جاتی ہے اور وہ شیخی' کبر' حبِ جاہ' حبِ مال اور منصب کی آرزوؤں سے بلند ہو جاتا ہے۔

جب فہمِ قرآن اور دعوتِ قرآن کے ذریعہ معاشرہ میں محبت و رواداری کو فروغ دینے کی بجائے اپنی شخصیت اور اپنی قائم کردہ جماعت کے علاوہ سب کی تنقیص و تنقید کا ''کارنامہ'' سرانجام دیا جائے' اپنی جماعت کو مسلمانوں کی ''الجماعہ'' کا مقام دے کر اس کی صداقت و حقانیت کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے' اپنی قوتوں کا قابلِ ذکر حصہ حریف دینی جماعت کی قوت کو کمزور کرنے میں صرف کیا جائے' نصب العینی معاملات

میں قرآن کی ایسی فکر اختیار کی جائے اور اس پر زور دیا جائے جس کی اجماعِ اُمت اور سلف صالحین کے اسلامی فکر سے تائید نہ ملتی ہو' یہ اور اس طرح کی دیگر باتیں واضح کرتی ہیں کہ قرآن سے کسب انوار کے ذریعہ تہذیب نفس کا نصب العینی کام ہونے کی بجائے قرآنی علم کو دوسرے مقاصد کے لئے ہی استعمال کیا جارہا ہے۔

گرامی قدر ڈاکٹر صاحب! آپ نے محترم نبی احمد لودھی صاحب کو یہ بھی عجیب بات لکھ دی ہے کہ ''البتہ قیامت کے روز دودھ کا دودھ پانی کا پانی علیحدہ ہو جائے گا''۔ اس معاملہ میں آپ کو تو یہ بات فرمانی چاہئے تھی کہ اپنے اپنے فہم ہیں' ممکن ہے ہمارا فہم صحیح نہ ہو' یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے فہم میں نقص ہو' بہرحال یہاں ہر ایک اپنے تصور کے مطابق کوشاں ہے' ہماری آرزو اور دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جمیع مسلمانوں کو اپنے فضل اور کرم سے معاف فرمائے اور آخرت میں سب کے ساتھ درگزر کا معاملہ فرمائے۔ چونکہ آخرت میں رسوائی سے بڑھ کر کوئی ہولناک بات نہیں ہے' اس لئے ہماری تو سب کے لئے یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کی شرم رکھ لے اور سب کو معاف فرمائے۔ اللہ کے سامنے محاسبہ کا حوصلہ اور جگر کس کا ہوسکتا ہے۔ آپ جیسے فہم قرآن کے داعی کو تو سب کی خیر' بھلائی اور نجات کا طالب ہونا چاہئے۔ اللہ کو بھی بندہ کی یہی ادا سب سے زیادہ پسند ہے۔

گرامی قدر ڈاکٹر صاحب! قرآن میں تقویٰ اور ایمان کے نتیجہ میں ایک ایسے نور کا وعدہ فرمایا گیا ہے' جس کی روشنی میں فرد دنیا میں چلتا پھرتا رہے گا' جیسا کہ سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۲۸ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے: ''سو جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے اور وہ شخص اپنے پروردگار کے نور پر چل رہا ہے (کیا ایسا شخص اور اہل قساوت برابر ہو سکتے ہیں) سو ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل اللہ کے ذکر کی طرف سے سخت ہیں''۔ (الزمر: ۲۲)

مومن کے قلب میں یہ ایک ایسی روشنی ڈالی گئی ہے جو شب و روز اس کی رہنمائی کرتی رہتی ہے اور اسے قرآن و سنت سے باہر جانے نہیں دیتی اور اس کے اندر عمل کی

ایسی قوت پیدا کر دیتی ہے کہ نفس اور حیوانیت مطیع ہو جاتی ہے۔ اس روشنی کے اثرات مومن کا پورا جسم محسوس کرتا ہے اور وہ ہر وقت طمانیت اور مسرت سے سرشار رہنے لگتا ہے۔ لیکن یہ روشنی رسمی ایمان اور رسمی اطاعت سے حاصل نہیں ہو سکتی' اس کے لئے دوئی سے نجات حاصل کر کے اللہ کے لئے یکسو ہو جانا پڑتا ہے۔ علمائے ربانی کا کہنا ہے کہ فرد جب تک انانیت' بڑے پن اور حبّ جاہ وحبّ مال کے باطنی جذبات سے دستبردار نہیں ہوتا اور دل کی سلامتی کے ساتھ خدا کی خدائی اور حدودِ اسلام میں داخل نہیں ہوتا' تب تک اسے قابل ذکر حد تک یہ نور حاصل نہیں ہوتا۔ یعنی اس نور کے حصول کے لئے اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت کے بڑے پن کے جذبۂ مظاہر سے دستبردار ہونا اور خدا کے بندوں میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ ہیچ تصور کرنے کی فہرست میں شامل رکھنا اور عجز' انکساری' خاکساری اور نفیٔ ذات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ قیمت ادا کئے بغیر اس نور کا حصول ممکن نہیں۔

آج اس نور سے بڑی حد تک محرومی کا نتیجہ ہے کہ ہماری مذہبی' کاروباری' سیاسی' انتظامی' تعلیمی اور ساری اجتماعی زندگی تضادات' خلفشار اور زوال سے دوچار ہو گئی ہے۔ بظاہر دین داری' دینی سرگرمیاں اور رسمی اعمال موجود ہیں' لیکن نورِ ایمان سے بڑی حد تک محرومی کی وجہ سے انفرادی و اجتماعی زندگی سے خیر و برکت اٹھ گیا ہے اور اپنے اعمالِ بد کا ادراک ہی سلب ہو گیا ہے۔ اگرچہ ظاہری علم' معلومات اور شعور میں اضافہ ہوا ہے' لیکن باطنی اور داخلی بیماریوں کے ہولناک غلبہ کی وجہ سے اندر کی روشنی بجھ گئی ہے اور افرادِ معاشرہ حقائق کے صحیح ادراک اور اپنی بیماریوں' کمزوریوں اور کوتاہیوں کے صحیح فہم سے قاصر ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں سب سے زیادہ ضرورت جس بات کی ہے' وہ یہ ہے کہ قرآن میں بیان کردہ نور کے حصول کی کوشش کی جائے اور قلب کو اس نور سے سرشار کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔ اس کے لئے ظاہر ہے باطنی بیماریوں' حبِ جاہ' حبِ مال اور حسد وغیرہ کی سنگینی کی نوعیت کو سمجھ کر ان امراض کی دوری کے لئے بھرپور کوشاں ہونا ہو گا۔

آخر میں ایک اور نکتہ بیان کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں' وہ یہ کہ تحریر' تقریر اور

خطابت کا اثر بالخصوص مضطرب روحوں پر ضرور پڑتا ہے' وہ افراد جو طلب رکھتے ہیں اور اسلام پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہیں' جن کے فطرت سلیمہ کے کچھ اجزاء محفوظ ہیں یا جن کے قلب کو حالات اور زمانہ کی چوٹ نے متاثر کیا ہے' ایسے افراد کی زندگیوں میں یقیناً تحریر و تقریر اور تنظیموں کی پیدا کردہ فضا سے تبدیلی آتی ہے اور وہ صراط مستقیم پر گامزن ہونا شروع ہو جاتے ہیں' لیکن اگر میرا دل محبتِ خداوندی سے خالی ہے' اخلاص کی گہرائیوں سے نا آشنا ہے' اس میں حبّ جاہ و حبّ مال اور انانیت کے بت مستحکم ہیں تو میری تحریر و تقریر اور جماعتی و تنظیمی سرگرمیاں میرے لئے تو معیت خداوندی اور رضائے الٰہی کے حصول اور نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتیں۔ اگر میری اپنی نجات خطرہ میں پڑ جائے تو ظاہر ہے اسلام کے نام پر تنظیمی' دعوتی اور علمی سرگرمیوں کی یہ قیمت بہت بڑا گھاٹا ہے' جس کی تلافی کسی صورت ممکن نہیں' یہ ہولناک خسارہ باطنی بیماریوں کے علاج سے بے پرواہی اور اخلاص و یقین کی کیفیت کے استحکام کے کام کو مناسب اہمیت نہ دینے ہی کا نتیجہ ہے' جو مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی بھگتنا پڑے گا۔

اس سلسلہ میں وہ حدیث رسول ہم جیسے اہل علم و اہل دانش کے لئے انتباہ کی حیثیت رکھتی ہے' جس میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن ایک جنتی شخص جب ایک عالمِ دین کو (جس کی تقریروں سے متاثر ہو کر اسے عمل صالحہ کی توفیق حاصل ہوئی) جہنم میں دیکھے گا تو وہ حیرت زدہ ہو کر اس سے دریافت کرے گا کہ یہ کیا ہوا؟ وہ عالمِ دین فرمائے گا کہ میں قیل و قال کا غازی تھا' جب کہ اخلاص اور عملِ صالحہ کی قوت سے محروم تھا۔

محترم ڈاکٹر صاحب! خط میں بیان کردہ نکات کے بظاہر مخاطب آپ ہی ہیں' لیکن حقیقت میں آپ سے زیادہ ان باتوں کی یاد دہانی اور تذکیر کا مستحق یہ عاجز ہے' اس لئے کہ روزمرہ زندگی میں نفس کی شہ زوری کے جو تجربات ہوتے رہتے ہیں' وہ المناک ہیں' اس لئے آپ کی شخصیت کے بہانے سے اصل تذکیر میری اپنی پیشِ نظر ہے۔ اس وضاحت کے بعد اُمید ہے کہ محسوس نہ فرمائیں گے۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

جواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترمی ومکرمی جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب۔ زید لطفکم!

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید واثق ہے کہ آپ مع جمیع اہل خانہ ومتعلقین جسمانی وروحانی دونوں اعتبارات سے بخیر وعافیت ہوں گے۔

آپ کا مفصل ومطول خط محررہ ۱۳ جولائی ملا۔ آج ۳۱ جولائی ہے، غنیمت ہے کہ اسی ماہ کے اندر اندر جواب تحریر کر رہا ہوں۔ جو تھوڑی بہت تاخیر ہوگئی ہے اس کے اسباب میں میری عمومی ناسازیٔ طبع پر مستزاد دو اسفار بھی شامل ہیں: ایک جانب شمال سوات کا اور دوسرا جانب جنوب کراچی کا!

میرا یہ گمان نہیں تھا کہ آپ مجھے تزکیہ نفس کی ضرورت واہمیت سے اس درجہ ناواقف اور غافل سمجھتے ہوں گے کہ اس موضوع پر ایک مبسوط مقالہ سپرد کرنے کی ضرورت محسوس کی! تاہم میں آپ کے وفور خلوص واخلاص اور شدتِ جذبۂ نصح و خیر خواہی کی تہہ دل سے قدر کرتا ہوں.....!

الحمدللہ کہ میں تزکیۂ نفس ہی نہیں تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کی اہمیت سے بھی درجۂ عالیہ میں نہیں تو درجۂ ادنیٰ میں ضرور واقف ہوں..... اس ضمن میں مجھے اپنی ایک کوتاہی کا احساس ہو رہا ہے۔ آپ کا تو یہ مسلسل کرم رہا ہے کہ آپ اپنی جملہ مطبوعات مجھے ارسال کرتے رہے ہیں..... لیکن اِدھر سے اس کا اہتمام نہیں ہو سکا.....

بنابریں میں اپنے چند کتابچے آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ ذرا وقت نکال کر اپنی نظر سے گزار لیں۔ (ان میں سے کسی کو اگر آپ پہلے پڑھ چکے ہوں تب بھی از راہ کرم دوبارہ دیکھ لیں......!)

اب ذرا میری چند معروضات آپ کے خط کے مشمولات کے بارے میں!

(۱) اسلامی تعلیمات کا ''نصب العینی ہدف'' عبادتِ ربّ' یا معرفتِ رب کو قرار دینا ایسی ہی غلطی ہے جیسی جماعت اسلامی نے اقامتِ دین کو نصب العین قرار دے کر کی تھی۔ بندۂ مومن کا بلند تر نصب العین صرف ''استرضائے باری تعالیٰ'' ہے یا دوسرے درجے میں صرف نجاتِ اخروی ...... باقی عبادت بھی فرض ہے ...... اور اقامتِ دین کی جدوجہد بھی فرض ہے' لیکن ان میں سے کوئی بھی ......نصب العین نہیں ہے!

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ بندۂ مومن کا نصب العین اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسے تعلق کا قیام ہے جس میں یہ تین DIMENSIONS موجود ہوں: ایک محبت باہمی (یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ ......سورۂ مائدہ) دوسرے رضاء باہمی (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ) اور تیسرے ولایتِ باہمی (اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ......اور...... اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ)!......اللہ ہم سب کو تعلق مع اللہ کی اس سہ گونہ کیفیت سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین!

(۲) بیسویں صدی عیسوی کی احیائی تحریکوں کی اس مشترک کمی کا میں بھی پوری طرح قائل ہوں کہ ان میں تعلق مع اللہ پر جتنا زور دیا جانا چاہئے تھا وہ نہیں دیا گیا۔ اس معاملے میں میرے اور آپ کے مابین فرق صرف اصطلاحات کا ہے......آپ اسے تزکیۂ نفس کی کمی سے تعبیر کرتے ہیں......اور میں ایمان کی کمی اور کمزوری سے! اس ضمن میں میری ۶۷ء کی تحریر: ''اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' کا ضرور مطالعہ کر لیں......(میرا یہ کتابچہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم ومغفور کو بھی بے حد پسند تھا اور پروفیسر

یوسف سلیم چشتی مرحوم نے تو اس پر ایک تائیدی اور تحسینی مقالہ بھی تحریر کیا تھا' جو میری تالیف: ''دعوت رجوع الی القران کا منظر اور پس منظر'' میں شامل ہے!)

(۳) تلاوتِ آیات' تزکیہ نفوس اور تعلیم کتاب و حکمت آنحضور ﷺ کے ''مقاصد'' نہیں بلکہ معمولات تھے یا طریق کار! آپؐ کی بعثت کا مقصد اوّلین تو وہی تھا جو جملہ انبیاء و رسل کا تھا یعنی دعوت و تبلیغ (بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ) اور وقت کے مشرکین اور ملحدین کے ساتھ ''جِدَال بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ'' کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانوں پر اتمامِ حجت!! ..... اور اس سے بلند تر سطح پر خاص آنحضور ﷺ کی بعثت کا مقصد 'اِظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ'' تھا (سورۂ توبہ آیت ۳۳' سورۃ الفتح آیت ۲۸' سورۂ صف آیت ۹) جس کے لئے مردانِ کار کے حصول اور ان کی تربیت کے لئے آپ ﷺ کا منہاج تلاوتِ آیاتِ قرآنی' تزکیہ نفوسِ انسانی' اور تعلیم کتاب و شریعت اور تعلیم حکمتِ ایمان و احکام شرعیہ پر مشتمل تھا۔ جسے میں نے اپنی تالیف ''نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت اور انقلابِ نبویؐ کا اساسی طریق کار'' میں واضح کیا ہے ..... (کیا میں یہ توقع کر سکتا ہوں کہ آپ اس کتاب کو پڑھ کر اس پر اپنا تبصرہ عنایت فرمانے کی زحمت گوارا کریں گے؟)

(۴) آپ نے اس حادثۂ فاجعہ کا ذکر بڑے غیر اہم انداز میں کر دیا ہے کہ ''حضور ﷺ کے بعد یہ تینوں چاروں کام امت کی مختلف شخصیتوں میں تقسیم ہوئے!'' حالانکہ یہی تو ہمارے زوال کا نقطۂ آغاز اور بدقسمتی کا اصل سبب ہے ..... کہ امت مسلمہ کی قیادت کی وہ توحیدی شان جو دورِ نبویؐ کے بعد خلافتِ راشدہ میں بھی قائم رہی ..... اولاً اس ثنویت کا شکار ہوئی کہ دینی و مذہبی قیادت اور ہوگئی اور سیاسی و عسکری قیادت اور! ..... اور پھر کسی قدر وقت گزرنے کے بعد دینی و مذہبی قیادت بھی تقسیم ہوگئی اور علومِ ظاہری کے ائمہ اور ہو گئے اور فن اصلاح باطنی کے ماہر اور! ..... گویا اُمت کی قیادت میں توحید کی بجائے تثلیث کا رنگ پیدا ہو گیا۔ اور ان تینوں طبقوں میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں انہیں ایک طبقہ تبع تابعین سے تعلق رکھنے والی شخصیت نے یوں

بیان کیا کہ ؎

”وما افسد الدِّینَ الاالملوک
واحبار سوءٍ ورھبانہا!“
(حضرت عبداللہ بن مبارکؒ)

اور بعد میں علامہ اقبال نے اس کی ترجمانی یوں کی کہ ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری!

......اس مسئلے میں اگرچہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ تو برے حکام وملوک اور علماءِ سوءٗ اور دنیا دار راہبوں اور صوفیوں کا ذکر ہے...... لیکن اس حقیقت سے تو ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب یہ چہارگانہ معمولاتِ نبوّت چار جداگانہ خانوں میں تقسیم ہو گئے اور ہر ایک نے ایک علیحدہ...... فن کی حیثیت اختیار کر لی تو تفسیر وحدیث وفقہ کے ضمن میں تو قدرے خیریت رہی (اگرچہ اسلامی فقہ میں تو ملوکیت کے زیر اثر مزارعت اور جاگیر داری اور بیع موَجل کی صورت میں سود بھی نقب لگا کر داخل ہو گئے) لیکن عقائد کے مباحث میں تو یونانی منطق اور فلسفہ کی آمیزش ہوئی جس سے اعتزال اور خلق قرآن ایسے فتنے بھی پیدا ہوئے اور ع ”ہیں صفاتِ ذاتِ حق‘ حق سے جدا یا عین ذات؟“ ایسی لاحاصل بحثوں کا طویل سلسلہ بھی شروع ہوا...... اور دوسری طرف تزکیہ نفس بھی ایک مستقل بالذات فن بن گیا جس میں نو افلاطونی نظریات اور ہندوستان کے جنان مارگ‘ کرم مارگ اور بھگتی مارگ کے تصورات و مشاغل بھی شامل ہوئے ...... اور ”تزکیہ نفس“ نے ایک خاص ٹیکنیک بلکہ ٹیکنالوجی کی صورت اختیار کر لی...... نتیجتاً علماء اور صوفیا کے مابین شدید اختلافات بھی پیدا ہوئے‘ چنانچہ تاریخ اسلام کے دوران مدرسہ وخانقاہ کی چپقلش کی داستانیں بہت دلچسپ ہیں!

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اسلام کے مقصد اعلیٰ کی جانب کوئی پیش رفت ممکن نہیں ہے جب تک اس کے لئے کارکن اور فدائین کا حصول اور ان کی تربیت کے چہار

پہلو عملِ نبویؐ کو آنحضور ﷺ کے اتباع کے طور پر ایک جامع پروگرام بلکہ حیاتیاتی اکائی (Orgranic Whole) کی حیثیت سے جاری نہ کیا جائے جیسے کہ امام دارالہجرہ حضرت امام مالکؒ نے فرمایا تھا کہ "لَنْ یَّصْلُحَ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا".

(۵) یہ حقیقت ہے کہ ایسی جامع الصفات قیادت کا میسر آنا ہرگز کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میں کبھی نہ مانتا کہ پوری دنیا میں دوبارہ بھی وہ کام ہوسکتا ہے جو خاتم النبیین اور کامل المرسلین حضرت محمد ﷺ کی قیادتِ مبارکہ میں ہوا اگر اس کی واضح خوش خبریاں اور پیشین گوئیاں آنحضور ﷺ نے نہ دی ہوتیں۔ (ہمارا ایک دعوتی چار ورقہ ہینڈ بل جو ہم نے لاکھوں کی تعداد میں طبع کرا کے تقسیم کیا ہے یعنی ''نوید خلافت''..... وہ بھی اس خط کے ساتھ ارسالِ خدمت ہے!) تاہم یہ عملاً کیسے ممکن ہوگا! اس کی ایک توجیہہ جس پر اللہ تعالیٰ نے مجھے انشراح صدر عطا فرمایا ہے..... یہ ہے کہ یہ کام تدریجاً ہوگا..... بمُحوائے الفاظِ قرآنی ''لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ'' (سورۃ الانشقاق)..... یعنی یہ کام کسی ایک قائد یا تحریک کے ذریعے ممکن نہیں ہوگا' بلکہ کئی نسلوں میں رفتہ رفتہ تکمیل پذیر ہوگا۔ پھر اسی کتابچے میں وہ احادیث بھی شائع کی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کام کا آغاز ارضِ پاکستان و افغانستان سے ہوگا۔ چنانچہ میرے نزدیک قیامِ پاکستان اللہ تعالیٰ کی اسی ''تقدیرِ مبرم'' کا مظہر ہے..... اگرچہ بظاہر حالات بہت ناموافق بلکہ حد درجہ مخالف ہیں! لیکن امت کی تاریخ کے الف ثانی کی چار صدیوں میں مجددین امت کا ظہور ارضِ ہند میں ہونا..... پھر بیسویں صدی عیسوی میں اقبال' ابوالکلام' مولانا الیاس اور مولانا مودودی جیسے اعاظم رجال کا سرزمین ہند میں پیدا ہونا' پھر تحریک خلافت کا صرف ہندوستان میں چلنا اور تحریک آزادی کے ضمن میں پوری دنیا میں صرف پاکستان کے لئے یہ نعرہ لگنا کہ ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ''..... اور سب سے بڑھ کر پاکستان کا لیلۃ القدر میں نزول ایسی آیاتِ بیّنات ہیں جن کی بنا پر یقین ہے کہ حالات بدلیں گے اور اسلام کی نشاۃِ

ثانیہ اور غلبۂ دین حق کے دور ثانی کا آغاز اسی خطۂ ارضی سے ہوگا اور تاریخی حقیقت بھی یہ ہے کہ ''تجدید واحیائے دین'' کی جدوجہد ارض ہند میں چار نسلوں سے تدریجاً بڑھتی آ رہی ہے..... اولاً اقبال نے اسلام میں دین و دنیا' مذہب و سیاست' اور دین و ریاست کی وحدت کا صور پھونکا..... اور اس جامع اور ہمہ گیر تصور دین کی تجدید کا کارنامہ سرانجام دیا' تاہم چونکہ وہ صرف مفکر تھے' عملی آدمی یا مرد میدان نہ تھے لہٰذا کسی عملی جدوجہد کا آغاز نہ کر سکے..... دین کے اس انقلابی فکر پر عمل کی پہلی کوشش مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۰ء تک ''حزب اللہ'' کے عنوان سے کی' پھر تیسری نسل میں مولانا مودودی سامنے آئے اور کام کو آگے بڑھایا۔ اور جب ان کی جماعت پاکستانی سیاست کی دلدل میں پھنس کر غیر مؤثر ہوگئی تو چوتھی نسل سے تعلق رکھنے والے اس خاکسار نے اس عمل کو کم از کم علمی وفکری اعتبار سے آگے جاری رکھا..... اور مجھے امید قوی ہے کہ اگلی نسل میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز! (ان چار نسلوں کے ضمن میں یہ سنین دلچسپ ہیں: چودھویں صدی کے مجدد اعظم حضرت شیخ الہند کا انتقال ۱۹۲۰ء میں ہوا..... اس کے بعد علامہ اقبال کا ۱۹۳۸ء میں' پھر ابوالکلام آزاد کا ۱۹۵۸ء میں اور بالآخر مولانا مودودی کا ۱۹۷۹ء میں..... اور اب یہ خاکسار بھی قبر کے کنارے بیٹھا ہوا ہے.....!)

اس ضمن میں میری ایک اہم تالیف ''برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل'' بھی ارسال خدمت ہے۔ ضرور مطالعہ فرمائیں اور اس پر بھی تبصرہ عنایت ہو جائے تو کیا ہی کہنے!

(۲) آخر میں آپ ایسے صوفیٔ صافی کے قلم سے بھی دو طنز کے تیر صادر ہوتے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ (i) ایک یہ کہ ''اس عاجز کی آرزو ہے کہ قرآن کے ذریعے معاشرہ میں اقامت دین اور غلبۂ دین کا کام کرنے والی شخصیت مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی مخالفت کے ردّعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھ کر محبتِ خداوندی کے زیر اثر کام کرے!''..... خدا گواہ ہے کہ مولانا مودودی یا جماعت اسلامی کی مخالفت ہرگز

کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہی۔ اگر ایسا ہوتا تو اپنا وہ اختلافی بیان جو میں نے ۱۹۵۶ء میں تحریر کیا تھا ہرگز دس سال روکے نہ رکھتا..... ہاں جب ۱۹۶۶ء میں میں نے جماعت اسلامی کی اصل تحریک کی تجدید کا بیڑا اٹھایا تو منطقی طور پر ضروری تھا کہ میں اس سے اپنے اختلافات کو واضح کرتا۔ خاص طور پر اس لئے کہ میں کسی نئی تحریک کے آغاز کا دعویٰ نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنے آپ اور اپنی مساعی کو اسی تحریک کا تسلسل قرار دے رہا تھا جو اقبال' ابوالکلام اور مودودی سے ہوتے ہوئے مجھ تک پہنچی تھی۔ اور اب تو واقعہ یہ ہے کہ سالہا سال سے کبھی مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کا ذکر تک میری کسی تحریر یا تقریر میں نہیں آیا۔ مصیبت یہ ہے کہ آپ صرف آج سے بیس سال قبل والے ڈاکٹر اسرار احمد سے واقف ہیں۔ (ii) دوسرا طنز یہ کہ ''نیز قرآن کو اوڑھنا بچھونا بنانے والی شخصیت اگر شدید ڈیپریشن کا شکار ہو جائے (جس کا ذکر میثاق یا حکمت قرآن میں ہوا تھا) تو پھر ایسی شخصیت کے گرد جمع ہونے والے افراد کا ڈیپریشن سے بچنا تو مزید مشکل ہوتا ہے.....'' محترم بھٹو صاحب! ڈیپریشن ایک جدید اور عام بول چال میں آنے والی اصطلاح ہے..... اس کی اقسام بہت سی ہو سکتی ہیں۔ انسان کو صدمہ و رنج کبھی اپنے ذاتی حالات سے بھی ہوتا ہے..... یہ ایمان باللہ' توکل علی اللہ اور راضی بہ رضائے ربّ کے خلاف ہے! بفحوائے الفاظ قرآنی ﴿لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ﴾ (سورۃ الحدید) لیکن ایک صدمہ اور رنج وہ بھی تھا جو آنحضور ﷺ کو کچھ عرصہ وحی رک جانے کے باعث اس حد تک ہوا تھا کہ آپ کے دل میں' معاذ اللہ' خودکشی تک کا خیال آتا تھا۔ (جدید ڈیپریشن کے ضمن میں بھی یہ بات مسلّم ہے کہ اس میں suicide کی tendency ہوتی ہے!) پھر ایک صدمہ و رنج حضور ﷺ کو مخالفین کی باتوں اور استہزاء و تمسخر سے بھی ہوتا تھا (وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ۔ سورۂ حجر)..... پھر ایک صدمہ وہ بھی تھا جس کے ضمن میں فرمایا گیا ہے کہ ''لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَنْ لَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ'' (سورۂ شعراء)..... اور ایک کیفیت رنج و غم اور افسردگی کی وہ بھی تھی جس کے ضمن میں

آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''شیبتنی ھود واخواتھا'' مزید برآں ''ڈیپریشن'' کی ایک شکل وہ ہے جسے صوفیاء نے ''قبض'' سے تعبیر کیا ہے..... اور تفسیر مظہری کے مصنف قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تو لکھا ہے کہ سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح اسی قبض کے ازالے اور علاج ہی کے لئے نازل ہوئی تھیں..... تو رنج وغم، صدمہ اور افسردگی، یہاں تک کہ کبھی کبھی عارضی طور پر مایوسی کا حملہ بھی ہرگز نہ ایمان کے منافی ہیں نہ شانِ نبوت کے (دیکھئے سورۂ یوسفؑ کی آیت ۱۱۰ پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا حاشیہ)

واضح طور پر جان لیجئے کہ میرے ڈیپریشن کا آغاز افغانستان پر اعداء اسلام کے حملے اور وہاں بے گناہ مسلمانوں کی اموات اور خصوصاً ایک اسلامی حکومت قائم کرنے والی جماعت طالبان کے جانی و مالی نقصان سے ہوا تھا..... یا پھر یہ ڈیپریشن امتِ مسلمہ پر آئندہ آنے والی مصیبتوں اور عظیم ہلاکتوں کے تصور سے ہے جنہیں میں اپنی اس آنکھ سے دیکھ رہا ہوں جس کا سرمہ ''خاکِ حجاز وحولِ قدس ہے!'' (واضح رہے کہ میں نے علامہ اقبال کے اس مصرعے کو اپنے لئے بدل لیا ہے کہ ''سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف!'' اس لئے کہ میرے نزدیک علم وحکمتِ صاحبِ مدینہ یعنی نبی اکرم ﷺ اور علم وحکمتِ مدفونِ نجف یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ دو جداگانہ چیزیں ہیں ہی نہیں۔ میں نے ''خاکِ حجاز'' میں ان دونوں کو جمع کر کے ان پر اضافہ خاکِ حولِ قدس کا کیا ہے جس سے اشارہ ہے علم وحکمتِ تورات وانجیل، جن دونوں کا مہبط وہ سرزمین تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ''اَلَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ'' سے تعبیر کیا ہے..... اور ایک مقام پر ''ارضِ مقدسہ'' بھی قرار دیا ہے)..... اس لئے میں اس بصیرتِ قرآن و حدیث اور تورات وانجیل کے ذریعے یہ دیکھ رہا ہوں کہ عالم عرب پر عنقریب Holocaust سے کہیں زیادہ شدید تر مصیبت نازل ہونے والی ہے..... اور پھر عین ممکن ہے کہ یہی معاملہ مسلمانانِ پاکستان کا ہو..... الغرض میری کیفیت اس وقت وہی ہے جسے آنحضور ﷺ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ''اگر تمہیں وہ سب کچھ معلوم ہو جائے جو مجھے معلوم ہے تو تمہارے چہروں پر کبھی مسکراہٹ بھی نہ آسکے!'' چنانچہ مجھے

اپنا یہ رنج وغم اور اس پر مبنی ڈیپریشن ع ''ترا غم ہے درحقیقت مجھے زندگی سے پیارا!'' کے مصداق بہت عزیز اور محبوب ہے...... !الحمدللہ کہ اس موضوع پر بھی میری اب سے دس سال قبل کی شائع شدہ تالیف موجود ہے جس کا عنوان ہے: ''سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی' حال اور مستقبل''......اس کا بھی ایک نسخہ ہدیۂ خدمت ہے!

(۷) بات طویل ہوتی جا رہی ہے......تاہم ''نفس انسانی'' کے بارے میں بھی چند باتیں ہو جائیں ۔اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ یہ ''اَمّارة بِالسُّوء'' ہے......اور اس کے امراض میں سے عظیم ترین تکبر اور حسد ہی ہیں۔ چنانچہ ان ہی کی بنا پر عزازیل راندہ درگاہِ حق ہو کر ابلیس لعین بنا تھا اور ان ہی کے باعث یہودی مردود و مغضوب و ملعون قرار پائے! پھر تکبر کی بھی بے شمار قسمیں ہیں' چنانچہ حسب نسب پر بھی تکبر ہوتا ہے' دنیاوی جاہ و جلال اور دولت و حشمت سے بھی تکبر جنم لیتا ہے' لیکن اس کی سب سے لطیف صورت جو عموماً اہل فکر و علم ......اور اصحاب سعی و عمل پر حملہ آور ہوتی ہے وہ ہے ''اِعجابُ کُلِّ ذی رأیٍ برأیہٖ'' یا ''اِعجابُ المرءِ بنفسہٖ'' جسے نبی اکرم ﷺ نے ''مُھلِکات'' میں سے ''اشدّھن'' قرار دیا ہے......

تاہم دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے: (i) ایک یہ کہ نفس انسانی ''سراسر شر'' نہیں ہے۔سورة الشّمس میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اس کی بلکہ اس کے ''تسویہ'' کی بھی قسم کھائی ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ نے اسی نفس میں نیکی اور بدی کی تمیز الہامی طور پر ودیعت کر دی ہے ......مزید برآں احادیث نبویہؐ میں اس نفس کے بھی ''حقوق'' ادا کرنے کی ترغیب وارد ہوئی' بمصداق ''اِنَّ لِنَفسِکَ عَلَیکَ حَقًّا ''......آپ کی تحریر سے اُس عیسائی اور ہندی تصوف کی بو آ رہی ہے جس کی رُو سے نفس سراسر شر ہے لہٰذا اس کی سرکوبی اور استہلاک (یعنی self- annihilation) ضروری ہے...... جبکہ اسلام نفس کشی کا نہیں صرف ضبطِ نفس (Self control) کا داعی و علمبردار ہے ......اور امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے تو اس نفس کی قوت اور شدت کو بھی پسندیدہ اور مطلوب شمار کیا ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ روحانی قوّت بھی اتنی ہی قوی اور

شدید موجود ہو۔ ان کے نزدیک انسانی شخصیت ''بھیمیت'' اور ''ملکیت'' کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے' گویا بقول سعدیؒ ''آدمی زادہ طرفہ معجون است.....از فرشتہ سرشتہ وزحیواں!'' پھر انہوں نے نفسیاتی اعتبار سے انسانوں کی جو درجہ بندی کی ہے اس کی رُو سے بلند ترین مقام پر وہ لوگ فائز ہوتے ہیں جن کی بھیمیت بھی قوی ہو اور ملکیت بھی!.....تو ایسے ہی لوگ دنیا میں عظیم کارنامے سرانجام دیتے ہیں' جب کہ وہ لوگ جن کی ملکیت تو قوی ہو لیکن بھیمیت کمزور وہ صرف ''نیک'' تو ہو سکتے ہیں!.....اصحاب دعوت وعزیمت نہیں! (چنانچہ بخاری کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو جنت کے غالباً تیس مردوں کے برابر قوتِ رجولیت عطا کی گئی تھی! واللہ اعلم!!) گویا نفس کی مثال گھوڑے کی سی ہے' وہ قوی ہوگا تو اس کا سوار بھی شہسواری کے کرتب دکھا سکے گا..... مریل گھوڑے کا سوار خود خواہ کتنا ہی قوی ہو کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا!

(ii) نیک نفس اور نیک دل لوگوں پر شیطان لعین اس راہ سے بھی حملہ آور ہوتا ہے کہ انہیں ان عوارض نفسانی سے ڈرا کر میدانِ عمل سے دور رکھے' اس لئے کہ اس میدان میں بہر حال ریاء وسمعہ ایسے باطنی امراض کے حملہ آور ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں.....اس طرح شیطان لعین ایسے نیک حضرات کو زاویوں اور خانقاہوں میں ''قلعہ بند'' کر کے اپنے اغواء واضلال کے عمل کے لئے آسانیاں پیدا کر لیتا ہے اور میدان صاف کر لیتا ہے.....یہی وجہ ہے کہ اس امر کی تاکید کی گئی ہے کہ خواہ کسی انسان کا اپنا عمل معیاری نہ ہو تب بھی وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتا رہے .....اس لئے کہ امید ہے کہ یہی عمل اس کی اپنی اصلاح کا ذریعہ بن جائے گا.....پھر یہ بھی واضح رہے کہ زاویوں اور خانقاہوں میں ''قلعہ بند'' لوگ بھی ''اعجاب المرء بنفسہ'' کے مہلک ترین مرض سے تو محفوظ نہیں ہو سکتے!.....الا من حفظہ اللہ!! بقول مولانا حالی مرحوم۔

''اے دل بشر وہ کون ہے جو خود ستا نہیں
پر خود ستائیوں کے ہیں عنواں جدا جدا!!''

(۸) ''اقامتِ دین'' کی جدوجہد کی بنیادوں میں ''تزکیہ نفس'' کو شامل کرنا واقعتاً بہت ضروری ہے اور جملہ احیائی تحریکیں بھی اس ضمن میں اپنے اپنے تصورات اور طریقہ ہائے کار کے مطابق کوشش کرتی رہی ہیں..... اور اس ضمن میں بھی بنظر غائر دیکھا جائے تو تدریجاً ترقی ہو رہی ہے.....!! البتہ یہاں بھی دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے: **(i)** میرے نزدیک تزکیہ نفس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ایمان کی گہرائی اور گیرائی میں مسلسل اضافہ کیا جائے۔ جیسے جیسے ایمان گہرے سے گہرا تر اور وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا اور الفاظ قرآنی کے مطابق ''وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ '' کی کیفیت پیدا ہوتی جائے گی' برے اعمال و اخلاق پت جھڑ کے پتوں کی طرح جھڑتے چلے جائیں گے..... اور جہاں ایمان کی گہرائی میں اضافے کا ایک ذریعہ اصحاب یقین کی صحبت بھی ہے..... اور ایک دوسرا ذریعہ شعائر اسلام پر مسلسل عمل پیرا رہنا بھی ہے (فحوائے سورۃ الحجرات آیات ۱۴ تا ۱۸)..... وہاں ''علیٰ وجہ البصیرت ایمان'' (سورۂ یوسف آیت ۱۰۸) کا سرچشمہ و منبع صرف ایک ہے اور وہ ہے قرآن حکیم۔ بقول مولانا ظفر علی خان مرحوم ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں!

چنانچہ یہ جنس نایاب ع ''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان!'' ہی کے ذریعے ہاتھ آتی ہے.....! اور **(ii)** دوسرے یہ کہ یہ بات آپ کی زبان یا قلم پر اس وقت زیب دے سکتی ہے جب آپ نے تزکیہ نفس کے عمل سے آغاز کر کے اقامت دین کی جدوجہد کے لئے کسی عملی تحریک کا خود آغاز کیا ہوتا..... اور اس کے لئے مردانِ کار ''انسانم آرزوست'' کے انداز میں تلاش کر کے انہیں کسی جماعتی یا تنظیمی ہیئت میں منسلک کیا ہوتا تاکہ وہ قوت فراہم ہو سکتی جو باطل سے براہ راست تصادم مول لے سکے' بقول علامہ اقبال ''با نشہ درویشی در سازو دمادم زن۔ چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!''..... ورنہ اگر آپ کے خیال کے مطابق (جو بالکلیہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور کسی

قدر غلط بھی!) ایک بازوان جدید احیائی تحریکوں کا مفلوج ہے..... تو دوسرا آپ کے یہاں مفقود ہے!..... (اس اعتبار سے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا حوالہ بھی آپ کے لئے مناسب نہیں ہے! اس لئے کہ انہوں نے سلاسل اربعہ میں بیعت کے بعد سلسلۂ محمدیہؐ میں بھی بیعت لی تھی اور اپنے مبایعین کو تزکیہ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کے مراحل سے گزار کر جہاد وقتال فی سبیل اللہ کے میدان میں بھی اتار دیا تھا..... **فغفر هم الله ورحمهم وادخلهم فی اعلیٰ علیین ! آمین**)

(۹) مجھے تو یاد نہیں تھا، البتہ آپ کے فرمانے پر یاد آ گیا کہ میں نے آپ کو تنظیم میں شمولیت کے لئے اپنے آپ سے ''بیعت'' کی دعوت دی تھی..... اس یاد دہانی پر اس وقت تو دل میں ایک ہوک سی اٹھی کہ کاش ایسا ہو جاتا اور آپ کی شمولیت سے ہماری تحریک میں تزکیہ نفس کی اہمیت زیادہ اجاگر ہو سکتی۔ باقی جس ٹیکنیکل نکتے کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کا ازالہ اُن ہی دنوں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مجاز اور جامعہ مدنیہ لاہور کے شیخ الحدیث اور مہتمم مولانا سید حامد میاںؒ نے مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے فرزند اکبر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (مقیم انگلستان) کے استفسار کے جواب میں فرمایا تھا..... **و هو هذا**: ''ڈاکٹر صاحب کی بیعت بیعتِ ارشاد نہیں ہے، بیعت جہاد ہے اور اس قسم کی بیعت کے لئے ضروری نہیں کہ صرف اسی شخص کے ہاتھ پر کی جائے جو خود کسی سے بیعت ہو کر تزکیہ نفس کرا چکا ہو، جو بیعت ارشاد کا لازمی تقاضا ہے۔ نیز اس قسم کی بیعت افضل مفضول کے ہاتھ پر کر سکتا ہے جیسے کہ ۱۹۳۰ء میں قادیانیت کے خلاف جہاد کے لئے ہیئت تنظیمی قائم کی گئی تو مولانا سید عطاء اللہ بخاری کے ہاتھ پر بیہقی وقت مولانا انور شاہ کاشمیریؒ اور شیخ وقت حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سمیت پانچ صد علماء نے بیعت کی تھی اور ظاہر ہے کہ متذکرہ بالا دو اعاظم رجال کے مقابلے میں تو مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی!''.....

فقط والسلام مع الاکرام

خاکسار اسرار احمد

قسط وار سلسلہ (۶)

جدید دنیائے اسلام

البانیہ

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

جدید دنیائے اسلام کے تعارف پر مبنی سید قاسم محمود صاحب کا یہ سلسلہ مضامین جون کے شمارے سے شروع کیا گیا تھا۔ اب تک آذر بائیجان، اردن، ازبکستان اور افغانستان کے حالات وکوائف پر پانچ مضامین شائع کئے جا چکے ہیں۔ اس سلسلہ کا چھٹا مضمون ''البانیہ'' پیش خدمت ہے۔ اگلے شمارے میں آپ ان شاء اللہ الجزائر کے تاریخ وجغرافیہ کا مطالعہ کریں گے۔ (ادارہ میثاق)

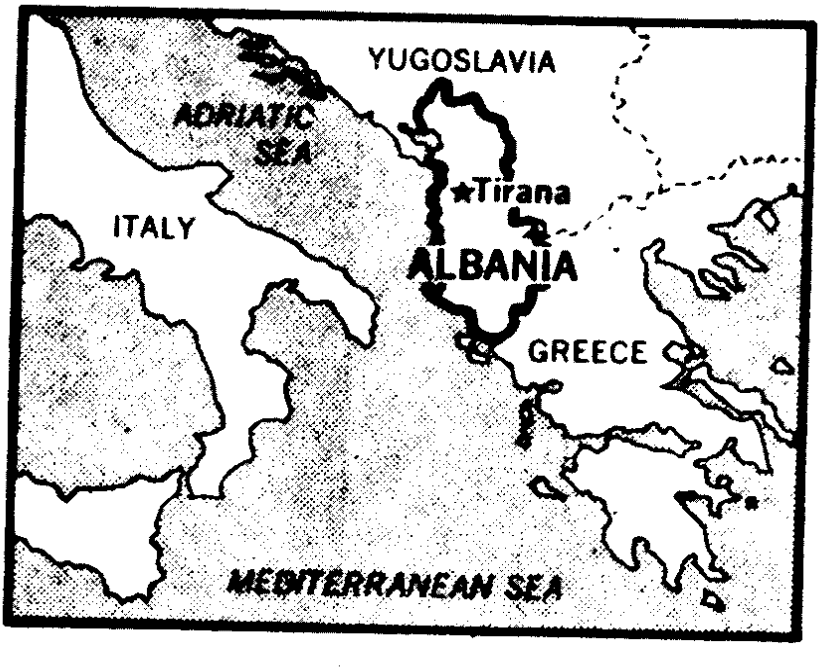

البانیہ: ایک نظر میں

سرکاری نام: ری پبلک آف البانیہ

موجودہ صدر: الفریڈ میوسیو (۲۰۰۲ء)

وزیراعظم: فاٹوس نانو (۲۰۰۲ء)

رقبہ: ۲۸ ہزار ۷۴۸ مربع کلومیٹر (۱۱ ہزار مربع میل)

آبادی: ۲۰۰۰ء میں اندازاً ۳۵ لاکھ ۴۵ ہزار

شرح افزائش: ۲.۱ فیصد

شرح ولادت: ۱۸.۶ فی ہزار

شرح اموات اطفال: ۳۸.۶ فی ہزار

گنجانی آبادی: ۳۱۹ فی مربع میل

دارالحکومت: ترانا (آبادی تین لاکھ)

کرنسی: لیک۔ ۱۰۰ اقطار کے برابر

زبانیں: البانوی، یونانی۔ سرکاری بولی ٹوسک

نسلیں: البانوی ۹۵ فیصد، یونانی ۳ فیصد، باقی جپسی، بلغاروی، سرب

مذہب: مسلمان ۷۵ فیصد، آرتھوڈوکس عیسائی ۱۵ فیصد، رومن کیتھولک ۱۰ فیصد

شرح خواندگی: ۷۲ فیصد

مجموعی قومی پیداوار: ۱۰.۵ ارب ڈالر

فی کس آمدنی: تین ہزار ڈالر

شرح افزائش: ۷.۵ فیصد

افراطِ زر: ایک فیصد

بے روزگاری: سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۶ فیصد، فی الحقیقت ۲۵ فی صد ہے۔

قابل کاشت رقبہ: ۲۱ فیصد

زراعت: گندم، مکئی، آلو، سبزیاں، پھل، کپاس

صنعت: غذائی صنعت، سوتی کپڑا، تیل، سیمنٹ، برقابی بجلی

قدرتی وسائل: کوئلہ، کرومیم، تانبا، قدرتی گیس، عمارتی لکڑی

اہل محنت: کل تعداد دس لاکھ ۷۰ ہزار۔ زرعی مزدور ۴۹.۵ فیصد۔ پرائیویٹ سیکٹر ۲۲.۳ فیصد، سرکاری سیکٹر ۲۸.۳ فیصد

برآمدات: کل مالیت ۳۱۰ ملین ڈالر۔ سوتی کپڑا، جوتے، اسفالٹ، دھاتیں، بجلی، خام تیل، سبزیاں، پھل، تمباکو

درآمدات: کل مالیت ایک بلین ڈالر، مشینری اور پرزے، اشیائے صرف، خوراک

اہم تجارتی ساتھی: اٹلی، یونان، جرمنی، بلجیم، آسٹریا، مقدونیہ، ترکی، بلغاریہ

البانیہ مسلم اکثریت کا واحد یورپی ملک ہے جو اب تک آزاد ہونے کے باوجود اشتراکیت کے پنجۂ اقتدار میں ہے۔ یہ ایک بلقانی ریاست ہے۔ ترکی زبان میں اسے ''آرناد ولق'' کہتے ہیں۔ البانیہ کے شمال اور مشرق میں یوگوسلاویہ' جنوب مشرق میں یونان' جنوب میں بحیرۂ روم اور مغرب میں آبنائے اوٹرنیٹو کے پار اٹلی واقع ہے۔ اس کا دو تہائی رقبہ پہاڑی ہے۔ دریا بہت کم ہیں۔ مغربی نشیبی علاقوں میں کچھ زرخیز میدان ملتے ہیں۔ بلند مقامات کی آب و ہوا سرد خشک ہے' البتہ ساحلی علاقوں میں گرم مرطوب آب و ہوا مل جاتی ہے۔ دروز البانیہ کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ پہاڑی علاقوں میں بھیڑ بکریاں پالی جاتی ہیں' جن کی اون برآمد ہوتی ہے۔ دارالحکومت ترانا ہے جو البانیہ کا سب سے بڑا شہر بھی ہے' جس کی آبادی تین لاکھ کے قریب ہے۔

تاریخی پس منظر

زمانۂ قدیم میں البانیہ میں ایپروس اور ایلیر یا نام کی دو حکومتیں تھیں۔ انہیں بازنطینی سلطنت نے ختم کر دیا۔ اور جب بازنطینی سلطنت بھی دو حصوں میں تقسیم ہوئی تو البانیہ مشرقی روم کی سلطنت کے حصے میں آیا' لیکن روم کے تسلط کے خلاف بغاوت مسلسل جاری رہی اور وہ اس علاقے پر اپنا مؤثر اقتدار قائم نہ کر سکی۔ بعد میں بلغاریہ نے اسے فتح کر لیا اور عرصے تک البانیہ کو اپنا محکوم رکھا' لیکن جب بازنطینیوں نے بلغاریہ کی حکومت ختم کی تو البانیہ از سر نو قیصر روم کے قبضے میں آ گیا۔

۱۳۴۰ء میں سرویا کے زار نے البانیہ فتح کیا۔ دریں اثنا اسلامیانِ ترکی کی طاقت ابھری۔

۱۳۷۲ء میں ایک بڑی جنگ کے بعد قیصر روم اور ترکوں میں جو معاہدہ ہوا' اس کی ایک شرط یہ تھی کہ قیصر روم کا بیٹا عثمانی ترکوں کے دربار میں بطور رہن رہے گا۔

۱۳۷۶ء۔ بلغاریہ نے خلافتِ عثمانیہ کی بالادستی تسلیم کر لی اور اس کی علامت کے طور پر بلغاریہ کی شہزادی کو مراد اوّل کے حرم میں داخل کیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد ۱۳۸۳ء میں عثمانیوں نے البانیہ کے خلاف قدم اٹھایا اور ۱۳۸۶ء میں انہوں نے البانیہ' رومانیہ اور ہنگری پر حملے کئے۔ ۱۴۴۸ء میں مراد دوم کے دور میں عثمانیوں نے البانیہ پر مکمل قبضہ کر لیا۔ ترکوں کی فوجی طاقت توڑنے کے لئے البانیہ' پولینڈ' بلغاریہ اور رومانیہ کا سوا لاکھ فوج پر مشتمل متحدہ مسیحی لشکر میدان میں آیا۔ ترک فوج کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ بالآخر دشمن نے شکست کھائی اور البانوی قوم نے محسوس کر لیا کہ ترکوں کی طاقت وسطوت جو بھی ہے' اسلام کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے عیسائیت ترک کر کے اسلام اختیار کر لیا اور ترکی کا حصہ بن گئے۔ یہ واقعہ ۱۴۶۸ء کا ہے۔

۱۴۶۸ء سے ۱۹۱۲ء تک مسلسل ساڑھے چار سو سال تک البانیہ ترکی کے زیر تسلط رہا۔ ۱۸۷۸ء میں البانویوں نے اپنی ایک علیحدہ سیاسی لیگ قائم کر لی' جسے عثمانیوں نے منتشر کر دیا' لیکن زیر زمین ان کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے عثمانی خلیفہ عبدالحمید ثانی کے خلاف زبردست

تحریک چلائی۔ اس کے ساتھ ہی کوہستانی قبائل نے بغاوت کر دی۔ جنگِ بلقان کے باعث حالات بدل گئے۔

۲۸ نومبر ۱۹۱۲ء کو سیاسی لیگ کے رہنما اسماعیل کمال نے البانیہ کی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی لندن میں یورپی ملکوں کے سفیروں کی کانفرنس ہوئی اور البانیہ کی آزادی اور خود مختاری کو تسلیم کر لیا گیا۔ پرنس ولیم کو البانیہ کا بادشاہ بنایا گیا' لیکن ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم چھڑی تو یہ بادشاہ سلامت ملک سے بھاگ گئے اور یوں البانیہ طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا۔ جون ۱۹۱۷ء میں اٹلی کے کمانڈر انچیف نے البانیہ کی آزادی کا مطالبہ کیا۔

۱۹۲۴ء تک قومی حکومت داخلی معاملات میں الجھی رہی۔ ۲۴ دسمبر کے عام انتخابات میں اسمبلی نے احمد بیگ زوغ کو پہلا صدر منتخب کیا۔ جنوری ۱۹۲۵ء میں البانیہ کے جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا گیا' لیکن ستمبر ۱۹۲۸ء میں دوبارہ بادشاہت قرار دیا گیا۔ صدر احمد بیگ زوغ نے اپریل ۱۹۳۹ء تک بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کی۔ جب البانیہ پر اٹلی کا قبضہ ہو گیا تو صدر احمد بیگ انگلستان بھاگ گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں البانیہ کو جرمن اور اطالوی فوج نے تاخت و تاراج کر دیا۔ ۱۹۴۴ء میں جب اٹلی نے اتحادی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو محاذ قومی آزادی کے کمیونسٹ رہنما انور ہوکسا کی قیادت میں البانیہ کی نئی حکومت قائم ہوئی۔

۱۰ نومبر ۱۹۴۵ء کو برطانیہ' امریکہ اور روس نے جنرل انور ہوکسا کی عبوری حکومت کو اس شرط پر تسلیم کر لیا کہ حکومت آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کرائے گی۔ ۲ دسمبر کو انتخابات ہوئے' جن کے نتیجے میں کمیونسٹ اسمبلی وجود میں آئی۔ کمیونسٹوں کی حکومت قائم ہونے پر امریکہ اور برطانیہ نے البانیہ سے تعلقات منقطع کر لئے اور البانیہ کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے کی تحریک کو بار بار ویٹو کیا۔

بالآخر ۱۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کو البانیہ اقوام متحدہ کا رکن بن گیا۔

۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۰ء۔ اشتراکی روس کی حمایت کی وجہ سے البانیہ ''وارسا پیکٹ'' میں شامل ہوتا ہے' لیکن روس اور البانیہ کے تعلقات میں سرد مہری پیدا ہو جاتی ہے' کیونکہ روس کا جھکاؤ یوگوسلاویہ کی طرف ہے' جہاں ساڑھے سات لاکھ البانوی نسل کے لوگ رہتے ہیں۔ پھر جب خروشچیف کے عہد میں روس اور چین میں نظریاتی اختلاف پیدا ہوتا ہے تو البانیہ چین کی حمایت کرتا ہے۔

۱۹۶۱ء۔ دسمبر میں روس ان اختلافات کی بنا پر البانیہ سے سفارتی تعلقات منقطع کر لیتا ہے۔

۱۹۶۲ء۔ البانیہ کو ''وارسا پیکٹ'' کے اجلاس میں حصہ لینے سے روک دیا جاتا ہے۔

۱۹۶۸ء۔ البانیہ ''وارسا پیکٹ'' سے علیحدہ ہو جاتا ہے' اور یوں البانیہ پوری دنیا سے کٹ کر تنہا رہ جاتا ہے۔

۱۹۸۵ء۔ مارچ میں دنیائے اشتراکیت کا بدترین آمر مطلق اور دنیائے اسلام کا بدترین دشمن انور ہوکسا ۳۹ سالہ جابرانہ حکومت کے بعد فوت ہو گیا۔ اس نے خود مسلمان ہونے کے باوجود مسلم

اکثریت کے اس واحد یورپی ملک البانیہ کو بے دین اور دہریہ معاشرے میں بدل دیا۔ اس کا طرزِ حکومت انتہائی پراسرار اور آمرانہ تھا۔ اس نے اپنے ملک کو دنیا کے دوسرے ملکوں سے پراسرار طریقے سے الگ تھلگ رکھا اور اپنے ہی ملک کے باشندوں کو دبانے اور کچلنے کے لئے ہر جارحانہ حربہ استعمال کیا۔ اپنے سیاسی حریفوں کو راہ سے ہٹانے کے لئے ہر ہتھکنڈا استعمال کیا۔ اس نے اپنے دیرینہ اور آزمودہ دوست محمد شیحو (وزیراعظم) کو بھی نہ بخشا' یہاں تک کہ اس نے خودکشی کر لی (۱۹۸۱ء)۔ علاوہ ازیں اس نے کمیونسٹ پارٹی کے قریبی ساتھی' آٹھ سینئر لیڈروں کو قتل کرایا' جن میں وزیر دفاع بھی شامل تھا۔

انور ہوکسا نے البانیہ کے مسلمانوں کو بالخصوص جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جو ملک کی آبادی کا ۷۵ فیصد ہیں۔ انور خود ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ زمیندار تھا۔ ۱۹۳۰ء میں جب وہ فرانس میں زیرِ تعلیم تھا' وہ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کے سرکاری جریدے کے لئے مضامین لکھنے لگا۔ اس پر البانیہ کی حکومت نے اس کا تعلیمی وظیفہ بند کر دیا۔ وہ پہلے برسلز چلا گیا' پھر ترانا آ گیا' جہاں کئی سال تک اس نے تمباکو کی دکان کھولے رکھی۔ یہ دکان کمیونسٹوں کا مرکز بن گئی۔ یہیں اس نے البانیہ کو اشتراکیت کی راہ پر چلانے کے منصوبے بنائے۔

۱۹۴۶ء میں جب البانیہ سرکاری طور پر ''ری پبلک'' بن گیا تو انور ہوکسا نے وزارتِ عظمیٰ' وزارتِ دفاع اور وزارتِ خارجہ کے تینوں کلیدی عہدے یکمشت حاصل کرتے ہی اپنے عزائم پورے کرنے کی پالیسی بنائی۔ مسلمانوں کی مسجدیں اور عیسائیوں کے گرجے یا تو مسمار کر دیئے گئے یا مقفل کر دیئے گئے۔ پولیس کو حکم دے دیا گیا کہ جس مرد کے چہرے پر داڑھی دیکھو' اسے گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دو۔ حتیٰ کہ داڑھی والے مسافروں کو ہوائی اڈے ہی پر پکڑ کر پہلے حجاموں کی دکانوں پر لے جایا جاتا' ان کی شیو کی جاتی' پھر ملک میں داخل ہونے کا پروانہ جاری کیا جاتا۔ مسلمان خواتین کو پردے اور حجاب والا لباس پہننے سے سختی سے روکا گیا۔ دارالحکومت ترانا اور دوسرے شہروں کے بازاروں میں ہزاروں مسلمان خواتین کو بے نقاب کر کے گھمایا پھرایا گیا۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ سؤر کا گوشت کھایا کرو۔ جس نے اس ہدایت پر عمل نہ کیا اسے سؤر کا گوشت کھانے پر مجبور کیا گیا۔ ختنہ کرانے کی قانوناً ممانعت کر دی گئی اور جو مسلمان چوری چھپے اپنے بچوں کے ختنے کراتے انہیں گولی سے اڑا دیا جاتا۔ قرآن مجید کی تلاوت پر پابندی عائد کر دی گئی۔

انور ہوکسا کی وفات کے بعد اس کے جانشین رمیز عالیہ نے بھی اپنے لیڈر کی غیر انسانی' غیر اخلاقی' سنگین اور تلخ روایات کو برقرار رکھا۔ اس نے آئین کی اس شق کو تبدیل کرانے سے انکار کر دیا جس کا تعلق مذہب سے ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ ''ریاست البانیہ کسی بھی مذہب کو تسلیم نہیں کرتی اور کسی بھی عقیدے کی حمایت نہیں کرتی۔ سرکاری طور پر دہریت کی تبلیغ و اشاعت کی جائے گی''۔

۱۹۹۱ء۔ مارچ میں نئے انتخابات ہوئے۔ ایک دفعہ پھر کمیونسٹ پارٹی کو فیصلہ کن اکثریت حاصل ہوئی' لیکن جلد ہی عام ہڑتالوں اور عوام کے احتجاجی مظاہروں نے کمیونسٹ حکومت کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ جون میں ''کمیونسٹ پارٹی آف لیبر'' نے چولا بدلا۔ اپنا نام بھی بدل کر ''سوشلسٹ پارٹی'' رکھ لیا اور اپنے سابقہ نظریات سے انحراف کا اعلان کر دیا۔

۱۹۹۲ء کے انتخابات میں حزب اختلاف کی جماعت ''ڈیموکریٹک پارٹی'' کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی اور اس کے رہنما ماہر امراضِ قلب ڈاکٹر سالی بریشا البانیہ کے پہلے منتخب صدر مامور ہوئے۔ اگلے برس سابق صدر رمیز عالیہ اور سابق وزیراعظم فاٹوس نانو کو بدعنوانی اور کرپشن کے متعدد الزامات کے تحت گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔

لیکن البانیہ کو جمہوریت اور آزاد معیشت راس نہ آئی۔ جتنی بھی اصلاحات کی گئیں' سب کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کھلی منڈی کی مارکیٹ جسے کچھ زیادہ ہی کھلا چھوڑ دیا گیا تھا اور جہاں راتوں رات امیر سے امیر تر بننے کے سرکاری منصوبے بنائے گئے تھے' دھڑام سے گر پڑی۔ عوام کے لئے سرکاری بچت کی کئی سکیمیں جاری کی گئی تھیں جو ناکام ثابت ہوئیں اور عوام کا ایک ارب ڈالر سے زیادہ کا بچتی سرمایہ ڈوب گیا۔ ان وجوہ سے ملک میں سیاسی لٹیروں کا راج شروع ہو گیا۔ طوائف الملوکی اور انتشار پھیل گیا۔ لوٹ مار اور دہشت گردی کا عام چلن ہو گیا۔ ۱۵۰۰ سے زیادہ افراد خانہ جنگی میں مارے گئے۔ بڑی مشکل سے امن و امان بحال کر کے نئے انتخابات کرائے گئے اور یوں صدر سالی بریشا کو صدارت سے ہٹانے میں عوام کو کامیابی حاصل ہوئی۔

۱۹۹۹ء میں البانیہ کو اپنے شمال میں واقع کوسوو کے اندرونی معاملات میں اس لئے مداخلت کرنی پڑی کہ وہاں ان کے ہم نسل' ہم مذہب اور ہم زبان البانوی باشندے آباد ہیں۔ البانیہ کو اتحادی افواج ''نیٹو'' نے بطور فوجی ہیڈ کوارٹر استعمال کیا۔ کوسوو کی خانہ جنگی کے دوران میں تقریباً ساڑھے چار لاکھ پناہ گزین البانیہ میں چلے آئے۔ ان میں سے تقریباً نصف نسلاً البانوی تھے۔ انہیں کوسوو سے جبراً نکال دیا گیا تھا۔

۱۹۹۹ء میں مذکورہ بالا خارجہ حالات میں علیر میٹا نئے وزیراعظم منتخب ہوئے۔ انہوں نے اپنے عہد میں معیشت کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے' پرائیویٹ تجارت اور کاروبار کو فروغ دینے' جرائم کی روک تھام کرنے' عدلیہ اور ٹیکس نظام میں اصلاحات لانے کی بھرپور کوشش کی۔

۲۰۰۰ء میں البانیہ کے پڑوسی ملک مقدونیہ میں البانوی نسل کے باشندوں نے اپنا جداگانہ تشخص منوانے کے لئے آزادی اور خودمختاری کی تحریک شروع کر دی۔ وزیراعظم میٹا نے پُرامن تحریک کی حمایت کی' لیکن باغیوں کی دہشت گردی کی مخالفت کی۔ اس کشمکش کو وہ تادیر برداشت نہ کر سکے اور جنوری ۲۰۰۲ء میں سیاست سے کنارہ کشی کر لی۔

۲۰۰۲ء۔ جون میں سابق جنرل الفریڈ میوسیو البانیہ کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کی حمایت فانوس نانو کی قیادت میں سوشلسٹ پارٹی نے بھی کی اور سالی بریشا کی قیادت میں ڈیموکریٹک پارٹی نے بھی کی۔

البانیہ میں اسلام کی اشاعت

البانیہ اور یونان کی درمیانی سرحد پر بطرنت کے مقام پر آثارِ قدیمہ کی جو کھدائیاں ہوئی ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام البانیہ میں عثمانی ترکوں کے عہد میں داخل ہوا تھا۔ اس مقام پر جو قبرستان برآمد ہوا ہے' اس میں پندرہویں صدی کی پکی قبریں ملی ہیں' جن پر عربی زبان میں کتبے تحریر ہیں۔ اس کے بعد زمانۂ وسطیٰ میں بکتاشیہ کی تحریک نے زور پکڑا۔

بکتاشیہ ترکی درویشوں کا ایک سلسلہ ہے جس کے بانی شیخ حاجی بکتاش ہیں۔ ان کے حالات زندگی کے بارے میں زیادہ تر افسانوی روایات سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں جو بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے' وہ یہ ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں حاجی بکتاش خراسانی کا ظہور اناطولیہ کے صوفی درویشوں میں ہوا' اور وہ غالباً بابا اسحاق کے مرید تھے' جنہوں نے ۱۲۴۰ء میں بغاوت کی تھی۔ سلسلۂ بکتاشیہ حاجی بکتاش کے اپنے حلقۂ مریدین سے وجود میں آیا۔ بہرحال یہ سلسلہ چودھویں صدی میں موجود تھا۔ سولہویں صدی کے آغاز میں شیخ بابا سلطان ''پیر دوم'' نے اس سلسلے کو معین شکل دی۔ مغربی ترکستان کے ترک درویشوں کے اداروں کو ان کے مخصوص خدوخال صوفی احمد یسوی نے دیئے تھے۔ اناطولیہ میں یہ ادارے وسیع ہوتے رہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں بدعتی رجحانات بھی داخل ہوتے گئے۔ بعض علاقوں میں بکتاشی درویشوں نے عیسائیوں کو بھی (ان کا مذہب تبدیل کئے بغیر) اپنے سلسلے میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جنوبی اناطولیہ اور البانیہ میں ایک مخلوط قسم کا مذہب پیدا ہوگیا جو اسلامی اور عیسائی عناصر پر مشتمل تھا۔

بکتاشی اسلامی عبادات و شعائر' حتیٰ کہ نماز تک سے غایت درجے کی لاپروائی برتتے ہیں۔ زیادہ تر شیعی عقائد کے حامل ہیں۔ وہ بارہ اماموں کے قائل ہیں' امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا خصوصاً بڑا احترام کرتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آنحضور ﷺ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملا کر تثلیث کے قائل ہیں۔ یکم محرم تا دس محرم ماتمی شب مناتے ہیں۔ فضل اللہ کی تالیف ''جاویدان'' اور فرشتہ اوغلو کی تصنیف ''عشق نامہ'' ان کے نزدیک شرعی قانون کا درجہ رکھتی ہیں۔

جب ان کے گروہ میں کوئی نیا شخص داخل ہوتا ہے تو اس موقع پر شراب' پنیر اور روٹی تقسیم کرتے ہیں۔ بکتاشی لوگ اپنے روحانی پیشواؤں کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ تمام عمر شادی نہیں کرتے اور اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز کرنے کی خاطر اپنے کانوں میں بالیاں پہنتے ہیں۔ ان کا مرشد علیحدہ ہوتا ہے۔

یہ لوگ کسی ایک خانقاہ کے صدر کو ''بابا'' اور اس سلسلے میں داخل ہونے والے کو ''درویش'' کہتے ہیں۔ جس نے حلف اٹھا کر پہلی بیعت کی ہو اُسے ''محب'' اور جو ابھی اس سلسلے میں داخل نہ ہوا ہو یعنی مبتدی ہو اُسے ''عاشق'' کہتے ہیں۔

بکتاشی لوگ ایک خاص قسم کی ٹوپی پہنتے ہیں جو چار گوشہ یا بارہ گوشہ ہوتی ہے۔ چار کے عدد سے ان کا اشارہ چار ابواب یعنی شریعت' طریقت' معرفت اور حقیقت کی طرف ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے وہ لوگوں کے بھی چار طبقات بناتے ہیں: عابد' زاہد' عارف اور محب۔ بارہ کا عدد بارہ اماموں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ ''تسلیم طاشی'' (سنگ تسلیم) گلے میں پہنتے ہیں' جس پر بارہ گول ابھری ہوئی لکیریں ہوتی ہیں۔

بکتاشیہ سلسلے کی بڑی بڑی خانقاہیں چار حصوں پر مشتمل ہوتی ہیں:

(۱) میدان اوی' اصل خانقاہ' جس میں عبادت گاہ بھی ہوتی ہے۔

(۲) اکمک اوی' تنور خانہ اور مستورات کے رہنے کی جگہ۔

(۳) آتش اوی' باورچی خانہ۔

(۴) مہمان اوی' مہمان خانہ۔

بکتاشیہ کے اس درویشی سلسلے نے ترک عوام کے مذہبی جذبات پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ بکتاشیوں نے حکومتِ عثمانیہ کے خلاف کئی بار بغاوتوں میں بھی حصہ لیا۔ ۱۸۲۶ء میں سلطان محمود ثانی نے ینی چری فوجیوں کو تباہ کیا تو یہ جماعت بھی جو ینی چریوں سے منسلک تھی' متاثر ہوئی۔ ان کی بہت سی خانقاہیں تباہ کر دی گئیں۔ ۱۹۲۵ء میں درویشوں کے تمام سلسلوں کے ساتھ بکتاشیہ سلسلے کو بھی ختم کر دیا گیا۔ آج کل یہ لوگ جزیرہ نمائے بلقان اور خاص طور پر البانیہ میں موجود ہیں۔ ان کی بڑی تعداد دارالحکومت تیرانہ میں ہے۔ سرکاری گنتی کے مطابق ان کی تعداد پچاس ہزار کے قریب ہے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق آج پورے البانیہ میں مساجد کی کل تعداد آٹھ سو کے قریب ہے۔ ان مساجد کے علاوہ بکتاشیوں کے ۳۶۰ تکئے (tekkes) ہیں۔ البانیہ کی قدیم ترین مسجد ۱۳۸۰ء میں قصبہ برات میں اُس زمانے میں تعمیر ہوئی تھی جب اس علاقے میں خلافت عثمانیہ اپنی حکومت قائم کر رہی تھی۔ دوسری قدیم ترین مسجد قوچی کے مقام پر ہے' جسے عرفِ عام میں مسجد الیاس مراہوری کہا جاتا ہے۔ یہ مسجد ۱۴۹۴ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ البانیہ میں شکودر مسجد واحد مسجد ہے جو استنبول کے شاہی طرزِ تعمیر اور اسلوب کے مطابق تعمیر ہوئی ہے۔ البانیہ کے مسلم کلچر اور مخصوص طرزِ تعمیر کی نمائندہ ترین مثال مسجد عبدالرحمٰن ہے جو پکنی کے مقام پر جمال اور جلال کے ساتھ دُور سے نظر آتی ہے۔ یہ ۱۸۲۲ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کا ایک مینار گھنٹہ گھر کا کام دیتا ہے اور پورے شہر کے مرکزی کلاک کی حیثیت رکھتا ہے۔

وہ لوگ جو سب سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہوئے' وہ البانیہ کے تیماری امراء تھے' جنہیں حکومتِ عثمانیہ کی طرف سے تیمار عطا ہوتے تھے۔ عام خیال کے برعکس' انہیں اپنی زمینیں بطور تیمار رکھنے کے لئے تبدیلیٔ مذہب کی ضرورت نہ تھی' بلکہ تیمار حاصل کرنے کے لئے صرف حکومتِ عثمانیہ سے وفاداری ہی کافی تھی۔ چنانچہ پندرہویں صدی میں عیسائیوں کو برابر تیمار ملتے رہے' مگر پندرہویں صدی کے آخر تک بہت ہی کم عیسائی تیماردار باقی رہ گئے' کیونکہ بہت سے لوگ برضا و رغبت خود مسلمان ہو گئے۔ شہر ایلبصان' جسے محمد ثانی نے ۱۴۶۶ء میں تعمیر کرایا تھا' ابتدا ہی سے اسلامی مرکز بن چکا تھا' لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عوام یا ''رعایا'' میں سے صرف معدودے چند آدمیوں نے ہی اسلام قبول کیا تھا۔

سولہویں صدی کے آغاز میں البانیہ کے چار سنجاقوں (اضلاع) میں مسلمان ''رعایا'' کے تقریباً تین ہزار خاندان تھے۔ کیتھولک دستاویزات میں جو ۱۶۲۲ء کے لگ بھگ تیار ہوئے' یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ البانیہ کی کل آبادی میں سے صرف تیسواں حصہ مسلمان ہے۔

سترہویں صدی کے آغاز میں اہل آسٹریا اور اہل وینس نے کیتھولک البانویوں اور آرتھوڈوکس سربیوں کو بغاوت پر ابھارنے کی کوشش کی' جو جزیئے میں اضافے کی وجہ سے حکومت سے بگڑ گئے تھے۔ ۱۶۱۴ء میں زعمائے کلیسا کے ایک اجلاس میں' جو قوچی میں منعقد ہوا' یہ قرار پایا کہ پاپائے روما سے امداد طلب کی جائے۔ ۱۶۲۲ء کے قریب سب سے پہلے فرانسیسی راہب البانیہ اور جنوبی سربیا میں تبلیغ کے لئے وارد ہوئے۔ ۱۶۴۹ء میں البانیہ کے کیتھولک عیسائیوں اور سربیوں نے اہل وینس سے تعاون کیا' اور پھر ۱۶۸۹ء میں آسٹریا والوں سے' جس کی بناء پر بابِ عالی نے ان لوگوں کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا' اس سے بچنے کے لئے بیچ' پرزرین' یاقوہ اور کوسووو کے میدانی علاقوں کے عیسائی باشندے' جن میں سے کچھ البانوی تھے' یا تو بڑی تعداد میں ہجرت کر گئے اور یا مسلمان ہو گئے۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے لوگ دل سے عیسائی ہی رہے' جو مقامی طور پر ''لارامانہ'' (بیچ رنگ) کہلاتے تھے۔ ان میدانی علاقوں میں البانوی بنانے اور مسلمان بنانے کا کام سترہویں صدی اور اٹھارہویں صدی میں برابر جاری رہا۔

علی پاشا کے عہد میں قبولِ اسلام کی رفتار نئے سرے سے تیز ہو گئی۔ دیہات کے دیہات حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ وہ خود بکتاشی تھا اور اس کے زمانے میں البانیہ میں سلسلۂ بکتاشیہ کو انتہائی عروج حاصل ہوا۔ بادشاہ زوغ کے عہد میں اس سلسلے کے پیروؤں کی تعداد کا اندازہ دو لاکھ کے قریب تھا۔ بکتاشیوں کے ان خوشحال تکیوں کی بدولت جو تیرانہ' آقچہ حصار' برات اور کوہستان تومور میں تھے' نیز صدر مقام میں ان کے مرکزی ادارے کے سبب بکتاشی سلسلے نے البانیہ میں بڑی اہمیت حاصل کر لی۔ ۱۹۱۹ء میں جو کانگریس کوریجہ میں ہوئی' اس میں بکتاشیوں نے سنّیوں سے الگ ایک علیحدہ فرقہ بنانا

چاہا' لیکن اُن کے اس ارادے کی تکمیل ۱۹۴۵ء میں اشتراکی عہد حکومت ہی میں ہو سکی۔

البانیہ کے باشندوں کو عثمانیوں کے رنگ میں رنگنے میں اسلام نے اہم حصہ لیا۔ البانیہ کے عیسائی اپنے مسلمان ہم وطنوں کو عموماً ترک کہہ کر پکارتے تھے۔ دوسری طرف اسلام ہی کی وجہ سے البانوی اپنے یونانی اور سلاوی (Slavic) ہمسایوں میں جذب نہیں ہو سکے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام اور عیسائیت دونوں کے ملمع کے نیچے البانویوں میں' خصوصاً پہاڑی علاقے کے البانویوں میں' ان کے ابتدائی مذہبی عقیدے باقی رہے۔

۱۹۴۴ء میں اشتراکیت کے زیر اثر آنے تک البانیہ اپنی مذہبی رواداری کے باعث پورے یورپ میں مشہور تھا' اس حد تک کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جب البانیہ پر ہٹلر کا قبضہ ہوا تو اُس نے مطالبہ کیا کہ البانیہ میں آباد تین سو (۳۰۰) یہودیوں کو جرمن فوج کے حوالے کر دیا جائے' لیکن حکومت البانیہ نے ہٹلر کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں نے مل کر یہودیوں کو پناہ دی۔ صرف پانچ یہودیوں کو جرمنی کے زبردست دباؤ پر اُن کے حوالے کیا گیا۔

جرمنی کی شکست اور روس کی فتح کے بعد جب البانیہ میں انور ہوکسا کی قیادت میں کمیونزم نے زور پکڑا تو اس نے مسلمانوں پر سخت تشدد کیا۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں ہوکسا کے حکم پر دو بکتاشی رہنماؤں بابا فوجو اور بابا فیزو کو قتل کر دیا گیا۔ اکثر مسلم علماء اور مساجد کے خطیب اور مولوی روپوش ہو گئے۔ مفتی مصطفیٰ آفندی وارو شی' سابق مفتیٔ اعظم البانیہ حافظ ابراہیم' اور تیرانہ کے شیخ زیمل پزاری غائب ہو گئے۔ خدا جانے کہاں چلے گئے! عام خیال یہ ہے کہ انہیں کمیونسٹ حکومت نے ہلاک کرا دیا۔ ۱۹۶۸ء میں ''آزاد البانیہ کمیٹی'' (نیویارک) نے ایک رپورٹ شائع کی تھی' جس میں بتایا گیا تھا کہ دوسو سے زیادہ مولویوں کو یا تو پھانسی پر چڑھا دیا گیا یا انہیں بیگار کیمپوں میں جبری مشقت اٹھانے کی سزا دی گئی۔

۱۹۶۷ء نے تشدد کی راہ پر ایک اور قدم بڑھایا اور سرکاری اور آئینی طور پر البانیہ کو دنیا کی پہلی دہریہ حکومت قرار دیا۔ مئی ۱۹۶۷ء تک ۲۱۶۹ مساجد' چرچ' خانقاہیں' اور تکئے مسمار کئے جا چکے تھے۔ مسلمان مرد و زن کو اسلامی لباس' داڑھی اور حجاب پہننے سے قانوناً منع کر دیا گیا۔ ان اقدامات کا ذکر اس مضمون میں پہلے آ چکا ہے۔

انور ہوکسا کا انتقال ۱۹۸۵ء میں ہوا۔ ۱۹۹۰ء کے اواخر تک جمہوری اصلاحات نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا۔ طلبہ کے زبردست مظاہروں نے ہوکسا کے جانشین رمیز عالیہ کو مذہب پر سے پابندیاں اٹھانے پر مجبور کر دیا' نہ صرف یہ بلکہ وہاں آزادیٔ تحریر و تقریر کا مطالبہ بھی مانا گیا' جس کے نتیجے میں نئی سیاسی جماعتیں بنانے کی راہ بھی ہموار ہو گئی۔

سنیوں اور بکتاشیوں کے علاوہ البانیہ میں چھ چھوٹے چھوٹے فرقے اور بھی ہیں' جن میں رفاعیہ اور خوانیہ زیادہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر فرقے کے پیروؤں کی تعداد ایک سو سے زیادہ

نہیں ہے۔ ممتاز اور سربرآوردہ مسلمانوں کے اندازے کے مطابق پورے البانیہ میں مسجدوں کے اماموں اور خطیبوں کی تعداد دوسو سے زیادہ نہیں ہے۔ عربی زبان پڑھنے والے البانوی مسلمانوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔

لیکن یہ صورت حال اب تیزی سے بدل رہی ہے۔ مذہبی رواداری کی نئی لہر شروع ہو جانے سے مسلمان اور عیسائی مبلغ باہر سے آ رہے ہیں اور البانیہ میں اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے پورا زور لگا رہے ہیں۔ یہ مبلغین اپنے ہمراہ لٹریچر' کتابیں' رسالے' ادویہ اور خوراک لاتے ہیں۔ عیسائی مبلغوں کے قائد خود جان پال دوم ہیں جو البانیہ کا بنفس نفیس دورہ کر چکے ہیں۔ اسی طرح سعودی عرب' کویت اور امریکہ سے مسلمان مبلغین نے ترانا میں اسلامی مراکز قائم کئے ہیں' تاکہ اسلام کی اشاعت کی جائے اور جو مساجد کمیونزم کے عہد میں مسمار کر دی گئی تھیں' انہیں از سر نو تعمیر کرایا جائے۔ عرب ملکوں کی اقتصادی امداد سے نئی نئی مساجد بھی البانیہ کے چپے چپے میں تعمیر کی جا رہی ہیں۔

البانیہ کے کاروباری حلقوں میں عرب کمپنیاں اہمیت حاصل کر رہی ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں پہلا پرائیویٹ' قرض دینے والا ادارہ ''عرب البانین اسلامی بینک'' قائم کیا گیا۔ یہ بینک البانیہ کے سرکاری بینک ''نیشنل کمرشل بینک'' اور بحرین اور سعودی عرب کے سرمایہ کاروں کے باہمی اشتراک سے قائم کیا گیا ہے۔ اس بینک کی خاص اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں واقع ہے۔ اس کا منظور شدہ سرمایہ ایک سو ملین ڈالر ہے۔ اس بینک سے قرضوں کے اجراء اور سرمایہ کاری کا فروغ اسلام کے اصولوں کی رہنمائی میں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کویت کی بھی ایک سرمایہ کار کمپنی نے البانیہ میں سرمایہ لگایا ہے۔

ایسے ٹھوس اقتصادی اقدامات کی وجہ سے بھی البانیہ کے مسلمانوں میں خود کفالت پیدا ہو رہی ہے۔

البانیہ کا عظیم محدث

یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے البانیہ کے عصرِ حاضر کے ایک عظیم محدث کو یاد نہ کرنا ایک بڑی فروگزاشت ہو گی۔ ہماری مراد شیخ محمد ناصر الدین البانی سے ہے جو ۱۹۱۴ء میں البانیہ میں پیدا ہوئے۔ شیخ البانی علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس اور منفرد شخصیت تھے۔ جب مدینہ منورہ میں اسلامی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی تو سعودی عرب کے مفتیٔ اعظم شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخ اس کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ حدیث کی تدریس کے لئے ان کی نگاہِ انتخاب شیخ البانی پر پڑی۔ شیخ نے یونیورسٹی میں اسناد حدیث کو ایک نئے مضمون کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ علامہ شیخ البانی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ ان کی کتابیں حدیث' فقہ اور عقائد کے موضوع پر ہیں۔

بنیادی طور پر شیخ البانی محدث ہیں۔ حدیث کی بحث و تحقیق میں شیخ نے صرف اُن مسلمہ اصول و

ضوابط کو پیش نظر رکھا ہے جو ائمہ حدیث کے وضع کردہ ہیں۔ ان کا منفرد انداز یہ ہے کہ وہ مختلف احادیث کے متون' اضافوں اور زوائد کو یکجا کر لیتے ہیں' پھر ان کو حدیث کے قواعد پر پرکھتے ہیں۔ ایک ہی حدیث کے مختلف متون کے تقابلی مطالعے سے صحت اور ضعف کے متعلق رائے قائم کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ حدیث کا اصلی مفہوم بھی نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اس تحقیق کے سلسلے میں وہ شخصیات سے متاثر ہوئے بغیر اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ضعیف حدیثوں کے برے اثرات سے محفوظ رکھا جائے' کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کے عقائد کو مسخ کر دیا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر انہوں نے سنن اربعہ یعنی سنن ابن ماجہ' سنن نسائی' سنن ترمذی اور سنن ابی داؤد کی صحیح اور ضعیف حدیثوں کو الگ الگ کر دیا۔ اندھی تقلید کے اس دور میں یہ بڑے حوصلے اور ہمت کا کام تھا۔ اس کام کو شیخ البانی جیسا مردِ درویش ہی کر سکتا تھا۔

شیخ البانی ۲ راکتوبر ۱۹۹۹ء کو طویل علالت کے بعد لگ بھگ ۸۶ برس کی عمر میں اردن کے دار الحکومت عمان میں وفات پا گئے۔ ماہنامہ ''میثاق'' لاہور کے شمارہ فروری ۲۰۰۰ء میں شیخ کی علمی خدمات پر ایک جامع مضمون پروفیسر خورشید عالم کا تحریر کردہ شائع ہوا۔ غالباً پاکستان میں یہ شیخ البانی کی شخصیت و خدمات پر واحد مضمون تھا جو پیش کیا گیا تھا۔

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن

تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجئے۔

ضروری اطلاع

قارئین محترم کے لئے یہ اطلاع یقیناً باعثِ مسرت ہو گی کہ جنوری 2004ء سے ''میثاق'' کی ضخامت میں 16 صفحات بڑھائے جا رہے ہیں تا کہ مضامین کی تعداد اور تنوع میں اضافہ کیا جا سکے۔ ضخامت میں اضافے کی وجہ سے جنوری 2004ء سے قیمت فی شمارہ 15 روپے اور اندرون ملک سالانہ زرتعاون 150 روپے ہو گا۔

قارئین اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرما لیں!

اشاریہ ماہنامہ ''میثاق''

جنوری ۲۰۰۲ء تا دسمبر ۲۰۰۳ء (جلد ۵۱، ۵۲)

مرتب: طارق اسماعیل ملک

تذکرہ وتبصرہ

اسرار احمد، ڈاکٹر

عالمی نظام خلافت، امارت اسلامی افغانستان اور مسلمانانِ پاکستان	جنوری ۲۰۰۲ء	ص ۷
بیسویں صدی کی احیائی تحریکوں کی ناکامی کے اسباب	فروری ۲۰۰۲ء	ص ۷
پاکستان میں اسلام اور سیکولرزم کی کشمکش	اپریل ۲۰۰۲ء	ص ۹
متحدہ مجلس عمل کی کامیابی: لائحہ عمل اور مشورے	نومبر ۲۰۰۲ء	ص ۶
حضرت شیخ الہندؒ، مولانا مدنیؒ اور بانی تنظیم اسلامی	فروری ۲۰۰۳ء	ص ۹

عاکف سعید، حافظ

نوشتۂ دیوار	جولائی ۲۰۰۲ء	ص ۴
اسی کے پردے میں زندگی کی نئی سحر جگمگا رہی ہے!	اگست ۲۰۰۲ء	ص ۴
اسلامی معاشرہ کی اساس اور بنیاد، نظریۂ توحید	اگست ۲۰۰۳ء	ص ۳
موجودہ عالمی حالات میں انفرادی واجتماعی سطح پر قرآن حکیم کی رہنمائی	دسمبر ۲۰۰۳ء	ص ۴

حقیقت دین

اسرار احمد، ڈاکٹر

مسئلہ شفاعت بحوالہ درس آیۃ الکرسی	مئی ۲۰۰۲ء	ص ۹
قرآن اور سنت کا باہمی تعلق	جون ۲۰۰۲ء	ص ۵
اسلام کا خاندانی نظام اور اس میں مرد کی قوامیت	جولائی ۲۰۰۲ء	ص ۱۷
ایمان بالآخرۃ کی اہمیت اور انکارِ آخرت کی مختلف صورتیں	اگست ۲۰۰۲ء	ص ۷
ختم نبوت کے دو مفہوم اور تکمیل رسالت کے علمی تقاضے	ستمبر ۲۰۰۲ء	ص ۵
اسلامی تنظیم میں سمع وطاعت کے تقاضے	اکتوبر ۲۰۰۲ء	ص ۲۴
اُمت مسلمہ ایک فیصلہ کن دوراہے پر	نومبر ۲۰۰۲ء	ص ۲۳

منتخب نصاب نمبر ۲ کے سلسلہ وار دروس

درس ۱: اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف (۱)	جنوری ۲۰۰۳ء	ص ۵

درس ۱: اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف (۲)	فروری ۲۰۰۳ء	ص ۴۲
درس ۱: اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف (۳)	مئی ۲۰۰۳ء	ص ۵
درس ۲: اقامت دین کی فرضیت اور اس کے لئے زوردار دعوت (۱)	جون ۲۰۰۳ء	ص ۵
درس ۲: اقامت دین کی فرضیت اور اس کے لئے زوردار دعوت (۲)	جولائی ۲۰۰۳ء	ص ۵
درس ۳: اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف (درس کا تتمہ)	اگست ۲۰۰۳ء	ص ۵
درس ۴: حزب اللہ کی تشکیل میں فیصلہ کن عامل بمقابلہ حزب الشیطان	ستمبر ۲۰۰۳ء	ص ۵
درس ۵: اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کی ہیئت ترکیبی اور تنظیمی اساس	اکتوبر ۲۰۰۳ء	ص ۵
درس ۶: بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں اسلامی انقلاب کیلئے آخری اقدام کا عنوان: 'نہی عن المنکر' اور 'محافظت حدود اللہ' کے ضمن میں طاقت کا مظاہرہ اور چیلنج	نومبر ۲۰۰۳ء	ص ۷
درس ۷: 'اطاعت امر' بمقابلہ 'تنازع فی الامر'	دسمبر ۲۰۰۳ء	ص ۹
رضوان علی		
گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کی حقیقت	مئی ۲۰۰۳ء	ص ۴۴

اسلامی نظامِ حیات

ابوالحسن علی ندوی		
عورت: اقبال کے کلام میں	جنوری ۲۰۰۲ء	ص ۴۱
ابوبکر الجزائری، مترجم عطاء اللہ ساجد		
مسلمانوں کا طرزِ حیات (کتاب الآداب)		
قرآن مجید کا ادب	جنوری ۲۰۰۲ء	ص ۵۹
رسول اللہ ﷺ کا ادب	فروری ۲۰۰۲ء	ص ۵۱
نفس کے آداب	اپریل ۲۰۰۲ء	ص ۱۰۴
مخلوق سے تعلق کے آداب (۱)	جولائی ۲۰۰۲ء	ص ۴۹
مخلوق سے تعلق کے آداب (۲)	اگست ۲۰۰۲ء	ص ۳۸
مخلوق سے تعلق کے آداب (۳)	ستمبر ۲۰۰۲ء	ص ۵۰
مخلوق سے تعلق کے آداب (۴)	اکتوبر ۲۰۰۲ء	ص ۴۴
مخلوق سے تعلق کے آداب (۵)	جنوری ۲۰۰۳ء	ص ۹۵
مخلوق سے تعلق کے آداب (۶)	فروری ۲۰۰۳ء	ص ۷۴
دوستی اور دشمنی کے آداب + مجلس کے آداب	اپریل ۲۰۰۳ء	ص ۸۹
کھانے پینے کے آداب + دعوت کے آداب	مئی ۲۰۰۳ء	ص ۴۹
آداب سفر + لباس کے آداب	جون ۲۰۰۳ء	ص ۲۶

خصالِ فطرت + نیند کے آداب	جولائی ۲۰۰۳ء	ص ۶۹
حسنِ خلق + صبر و تحمل	اگست ۲۰۰۳ء	ص ۴۵
توکل اور خود اعتمادی + ایثار	اکتوبر ۲۰۰۳ء	ص ۳۹
این کے نذر اخیل		
سچی مسلمان خاتون کا کردار اور جدید خواتین	جنوری ۲۰۰۳ء	ص ۱۰۷
پروین رضوی، ڈاکٹر		
کیا پردہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟	جون ۲۰۰۲ء	ص ۷۳
عبدالمجیب		
مرد اور عورت میں مساوات یا فضیلت	اپریل ۲۰۰۳ء	ص ۷
محمد آصف احسان عبدالباقی		
آزادیٔ نسواں یا فحاشی کا فروغ	جنوری ۲۰۰۲ء	ص ۶۵
آزادیٔ نسواں کی صدائے بازگشت	مئی ۲۰۰۲ء	ص ۷۲
محمد عطاء اللہ صدیقی		
تحریکِ نسواں یا تحریکِ نازن	جون ۲۰۰۳ء	ص ۷۰
خاتونِ خانہ کی محنت کا معاوضہ	ستمبر ۲۰۰۳ء	ص ۵۵
محمد یونس جنجوعہ		
حقوقِ اولاد	فروری ۲۰۰۲ء	ص ۵۷
قرض کا لین دین اور اسلامی تعلیمات	اکتوبر ۲۰۰۳ء	ص ۵۳

تحقیقات و تنقیحات

ابوالاعلیٰ مودودی		
دارالاسلام میں مذاہبِ کفر کی تبلیغ کی اجازت کیوں نہیں؟	جنوری ۲۰۰۲ء	ص ۳۱
خالد محمود عباسی		
فکرِ اسلامی کو مسخ کرنے کی سازش	اگست ۲۰۰۲ء	ص ۵۲
ریاض الحسن نوری		
پاکستان اور عدلیہ کی آزادی	اپریل ۲۰۰۲ء	ص ۴۷
صدرالدین اصلاحی		
اسلام ایک مکمل نظامِ حیات	ستمبر ۲۰۰۲ء	ص ۵۹

عبدالحق بیو لے
احیاءالعلوم کے بعد کا یورپ اور آج کا اسلام — اگست ۲۰۰۳ء — ص ۲۸

عبدالغفار حسن
اسلام اور موسیقی — جنوری ۲۰۰۳ء — ص ۵۳

عتیق الرحمٰن سنبھلی
واقعہ کربلا' حقائق وواقعات کی روشنی میں — اپریل ۲۰۰۲ء — ص ۳۷

محبوب الحق عاجز
اسلامی نظام خلافت ضروری کیوں؟ — اپریل ۲۰۰۲ء — ص ۵۴

محمد اسحٰق
مدیر ''اشراق'' کی خدمت میں — جون ۲۰۰۲ء — ص ۶۰

محمد اسلم رانا
بائبل کی ایک پیشین گوئی کا مطالعہ — فروری ۲۰۰۲ء — ص ۷۵

محمد شریف
اسلام کا تصور عبادت — جولائی ۲۰۰۲ء — ص ۴۳

محمد یونس جنجوعہ
بدعات کیوں قابل مذمت ہیں؟ — جنوری ۲۰۰۳ء — ص ۸۷

مختار حسین فاروقی
ذکر کثیر سے کیا مراد ہے؟ — اگست ۲۰۰۲ء — ص ۳۵

نذیر احمد ہاشمی' حافظ
ولیے کا وجوب اور جامع ترمذی کی ایک روایت — اگست ۲۰۰۲ء — ص ۵۰

دعوت وتحریک

اسرار احمد' ڈاکٹر
تحریک اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ۔ یا چناں کن یا چنیں! — جنوری ۲۰۰۳ء — ص ۲۷

ہماری دینی وتحریکی فکر اور اس کے تقاضے اور امریکی معاشرے میں دعوت
واقامت دین کے کام کی ممکنہ عملی صورت — فروری ۲۰۰۳ء — ص ۶۳

اسلام انتخابی سیاست کے ذریعے نہیں آ سکتا' اس کے لئے انقلابی طریق
کار ناگزیر ہے۔ ایک فکر انگیز انٹرویو — اپریل ۲۰۰۳ء — ص ۱۵

مولانا مودودی مرحوم اور مسئلۂ بیعت — اپریل ۲۰۰۳ء — ص ۱۵

امریکی معاشرے میں دعوت واقامت دین کے کام کی ممکنہ عملی صورت	اگست ۲۰۰۳ء	ص ۵۷
تنظیم اسلامی شمالی امریکہ۔ ماضی، حال اور مستقبل	ستمبر ۲۰۰۳ء	ص ۲۸
انوار الحق چوہدری		
تنظیم اسلامی کا آل پاکستان اجتماع	اپریل ۲۰۰۳ء	ص ۱۰۲
حامد سجاد		
دین ہم سے کیا چاہتا ہے؟	جولائی ۲۰۰۳ء	ص ۵۷
فرحت عزیز		
قرآنی راہ نمائی واسوۂ رسول	اپریل ۲۰۰۲ء	ص ۴۴
محمد یوسف اصلاحی		
فرض آپ کو پکار رہا ہے!	جنوری ۲۰۰۳ء	ص ۸۲
منظور حسین		
تعارف ودعوت تنظیم اسلامی	اپریل ۲۰۰۲ء	ص ۹۵
میر بادشاہ بخاری		
تحریک مجاہدین، جنگ بالاکوٹ کے بعد	جون ۲۰۰۲ء	ص ۴۱
نوید احمد		
تاریخ تنظیم اسلامی	نومبر ۲۰۰۲ء	ص ۶۳
وصی مظہر ندوی		
اسلامی احیائی تحریکوں کی ناکامی کے اسباب	اپریل ۲۰۰۲ء	ص ۷۷

☆ ☆ ☆

✿ تنظیم اسلامی کے بانی امیر کی جانب سے منتقلیٔ امارت کا اعلان	اکتوبر ۲۰۰۲ء	ص ۴
✿ امارت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد اراکین عاملہ وشوریٰ سے امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید صاحب کا خطاب	اکتوبر ۲۰۰۲ء	ص ۹
✿ منتقلیٔ امارت کے موقع پر بحیثیت امیر تنظیم اسلامی تنظیم کے بانی و مؤسس کا الوداعی پیغام	اکتوبر ۲۰۰۲ء	ص ۱۳

تذکیر وموعظت

آمنہ اشفاق		
انفاق فی سبیل اللہ	مئی ۲۰۰۳ء	ص ۶۳

ابن القیم الجوزیہ
دل مردہ دل نہیں ہے..... اکتوبر۲۰۰۳ء ص۵۱
ابوالحسن علی ندوی
دوروزے نومبر۲۰۰۲ء ص۱۳
اسرار احمد' ڈاکٹر
''وَمَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ'' حیاتِ دُنیوی کی ایک عظیم حقیقت فروری۲۰۰۳ء ص۱۷
سید قطب شہیدؒ
اسلام کے نظام تربیت میں عبادت ربّ کا مقام اپریل۲۰۰۳ء ص۵۶
صلاح الدین ناسک
''کاش میں اُسؓ کے پاس جاسکتا اور اُسؓ کے پاؤں دھوتا'' اگست۲۰۰۲ء ص۷۵
عظمیٰ طاہر
غرور وتکبر اپریل۲۰۰۳ء ص۸۱
محمد آصف احسان عبدالباقی
تقویٰ کے فوائد وثمرات اکتوبر۲۰۰۲ء ص۵۷
محمد زکریا' شیخ الحدیث
تباہی کے اس دور میں مسلمانانِ عالم کیا کریں؟ فروری۲۰۰۳ء ص۸۵
محمد یونس جنجوعہ
مسواک کی اہمیت وفضیلت اکتوبر۲۰۰۲ء ص۷۷
رمضان المبارک: نیکیوں کی نشوونما کا موسم بہار نومبر۲۰۰۳ء ص۴۳
مقصود الحسن فیضی' ابوکلیم
جھوٹ کی مذمت جولائی۲۰۰۳ء ص۳۹
نوید احمد
انفاق فی سبیل اللہ نومبر۲۰۰۳ء ص۴۷

نقطۂ نظر

عابداللہ جان
سانحۂ افغانستان کے اصل محرکات فروری۲۰۰۲ء ص۳۳
کرم الٰہی انصاری
جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جولائی۲۰۰۲ء ص۵۹

قوموں کے عروج وزوال کا اسلامی اصول	جون ۲۰۰۳ء	ص ۴۳
نورالامین شاد		
عائلی قوانین کا قضیہ اور کثرت ازواج	جنوری ۲۰۰۲ء	ص ۶۷

خطوط ونکات

اسرار احمد، ڈاکٹر		
سید شہاب الدین کے دو اہم خطوط اور ان کا جواب	نومبر ۲۰۰۳ء	ص ۶۱
ایک اہم نصیحت نامہ (از حافظ محمد موسیٰ بھٹو) اور اس کا جواب	دسمبر ۲۰۰۳ء	ص ۳۹
محمد فہیم		
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات!	جولائی ۲۰۰۲ء	ص ۷۰

ظروف واحوال

اسرار احمد، ڈاکٹر		
صدر مشرف کے ''تاریخی'' خطاب پر بانی تنظیم اسلامی کا تبصرہ	فروری ۲۰۰۲ء	ص ۶
ملکی وملی مسائل پر بانی تنظیم اسلامی کا اظہار رائے	اپریل ۲۰۰۲ء	ص ۷
ملکی وملی مسائل پر بانی تنظیم اسلامی کا اظہار رائے	ستمبر ۲۰۰۲ء	ص ۷۷
بانی تنظیم کا خطاب جمعہ اور ڈاکٹر عامر عزیز کی گرفتاری کے خلاف مظاہرہ	نومبر ۲۰۰۲ء	ص ۷۸
ملکی وملی مسائل پر بانی تنظیم اسلامی کا اظہار رائے	نومبر ۲۰۰۳ء	ص ۴
غلام اللہ حقانی		
تہذیبوں کی جنگ فیصلہ کن مرحلے میں (۱)	جنوری ۲۰۰۲ء	ص ۵۰
تہذیبوں کی جنگ فیصلہ کن مرحلے میں (۲)	فروری ۲۰۰۲ء	ص ۴۳

سیرت وسوانح

خورشید احمد، پروفیسر		
ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ	مئی ۲۰۰۳ء	ص ۴۷
محمد یونس جنجوعہ		
ثانی اثنین۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	جولائی ۳۰۰۳ء	ص ۲۹
مہر محمد خطیب		
ثانی اثنین۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	مئی ۲۰۰۳ء	ص ۲۵

دنیائے اسلام

سید قاسم محمود		
آذربائی جان	جون ۲۰۰۳ء	ص ۵۱
المملکة الهاشمیة الاردنیة	اگست ۲۰۰۳ء	ص ۶۱
ازبکستان	ستمبر ۲۰۰۳ء	ص ۶۱
افغانستان	اکتوبر ۲۰۰۳ء	ص ۶۱
جدید افغانستان	نومبر ۲۰۰۳ء	ص ۶۷
البانیہ	دسمبر ۲۰۰۳ء	ص ۶۹

متفرقات

اسرار احمد، ڈاکٹر		
قومی اخبارات کو جاری کردہ تین اشتہارات	مئی ۲۰۰۲ء	ص ۶
شیخ محمد اقبال، علامہ		
فکر اقبال: ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر	مئی ۲۰۰۲ء	ص ۴۷
محمد آصف احسان عبدالباقی		
حضور ﷺ کا تبسم	فروری ۲۰۰۲ء	ص ۶۷
محمد منیر احمد		
اولی الناس بابراهیم	اپریل ۲۰۰۲ء	ص ۹۰
محمد وقاص اطہر		
بڑا بے ادب ہوں.....	اپریل ۲۰۰۳ء	ص ۷۱

عرض احوال

میثاق کے ادارتی صفحات پر بالعموم حافظ عاکف سعید صاحب کی تحریر ''عرض احوال'' کے عنوان سے شائع ہوتی ہے۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء اور نومبر ۲۰۰۳ء کے شمارے میں حافظ خالد محمود خضر کی ادارتی تحریریں شائع ہوئیں۔